[illegible]

روزگارِ فقیر

(شاعرِ مشرق سے چند ملاقاتوں کی یادداشت)

از

فقیر سیّد وحید الدّین

★

ملنے کا پتہ

سنّہاؤز ۷۵ دی مال

[redacted]

پہلا ایڈیشن دو ہزار

ذخيرة [illegible]

ذکارِ رفقا

... سے چند ملاقات...

از

... مسعود ...

پہلا ایڈیشن دو ہزار

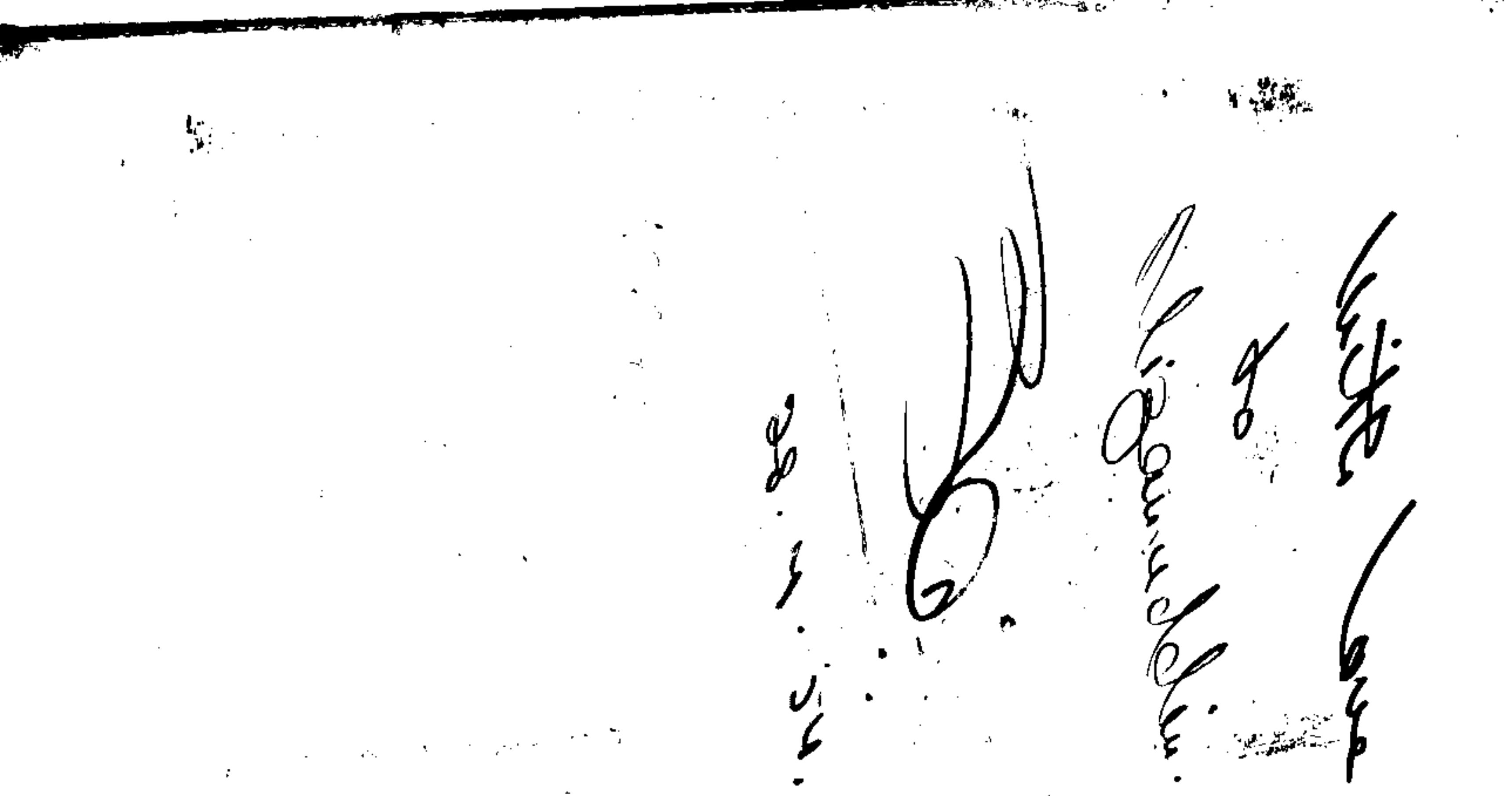

اِنتساب

شاعرِ مشرقؒ کے نام

اگر کاوے درونم را خیالِ خویش را یابی
پریشاں جلوہ چو ماہتاب اندر بیابانے

(اقبالؒ)

وحیدالدین

پیش لفظ

شاعرِ مشرق علامہ اقبال مرحوم سے بچپن میں مجھے

ف نصیب ہوا۔ اور مرحوم کی وفات تک یہ سعادت مجھے نصیب

ت سے ان متفرق ملاقاتوں کے تاثرات میں ایک امانت

طرح اپنے دل میں لیے پھرتا ہوں۔

آج یہ امانت میں نے آپ کے حوالے کردی ہے

مجھے احساس ہے۔ کہ یہ تاثرات پریشاں اور یہ اوراق

اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ مرحوم سے میری ملاقاتیں بھی تشنہ

قسمت کہیے کہ مرحوم کی

رہتے ۔ میں نے ان سے خاطر خواہ فائدہ نہیں اٹھایا۔ بچ

اری لاابالی پن اور کچھ عنفوانِ شباب کی کج نگاہی کے باع

یکن مدتوں مرحوم کے صحیح مقام اور جاوید عظمت کا اندازہ نہ کرسکا

اگر ایسا ہوتا ۔ تو آج میں آپ کی خدمت میں زیادہ جامع اور زیاد

فی بخش تصنیف پیش کرسکتا ۔ اِن کوتاہیوں کے باوجو

یں نے یہ اوراق آپ کی خدمت میں پیش کرنے کی جسارت

ان لئے کی ہے ۔ کہ اوّل علامہ مرحوم سے ہر متعلقہ امر کو

م کی ودیعت سمجھتا ہوں ۔ اور دوم مجھے فخر ہے ۔ کہ میں بھی

حوم کے معاصرین کی اس نسل سے تعلق رکھتا ہوں جس

سل کوئی یہ کہہ نہیں سکے گا ۔ کہ میں نے مشرق کے

... کو اپنی آنکھوں سے دیکھا

کی پرشکوہ آواز اپنے کانوں سے سُنی ہے۔"

بغداد الجدید

۲۷ فروری ۱۹۵۰ء

فقیر سید وحید الدین

سرود رفتہ باز آید کہ ناید
نسیم از حجاز آید کہ ناید
سر آمد روزگارِ ایں فقیرے
دگر دانائے راز آید کہ ناید

(علامہ اقبال)

تعارف

ہمارے روایتی ادب میں تنقید نگاری تذکرہ نگاری ہی کا
ایک جزو تصور کی جاتی تھی۔ ہمارا پرانا تنقیدی ادب بیشتر تذکروں
ہی سے عبارت ہے۔ بہت ممکن ہے کہ ہمارے پرانے نقادوں
نے کبھی جامع اور واضح نظریہ کے ماتحت ادب اور زندگی کو
سمجھا نہ کیا ہو۔ لیکن کم از کم انہیں یہ شعور ضرور تھا کہ تخلیق کے
ادراک کے لئے خالق سے شناسائی ضروری ہے۔ اور خالق کو
سمجھنے کے لئے اس کی دنیوی زندگی کے زمان و مکان کا تعین
لازم۔ اس روایتی اسلوب میں خامیاں بھی تھیں۔ ایک ہی وقت میں

تصنیف اور مصنف دونوں کی تصویر کھینچنے میں مصوّر کا قلم بسا
اوقات لغزش کھا جاتا تھا۔ اور تصویر کے دونوں رُخ ادھورے
رہ جاتے تھے لیکن تذکرہ نویسوں کی جُملہ خامیوں کے باوجود اس
امر سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کہ اگر ان کی فراہم کردہ واقعاتی معلومات
ہمیں میسر نہ ہوتیں۔ تو ہمارے ادب کی تاریخ بہت حد تک تشنہ
در نا مکمل رہ جاتی۔ ادب کیطرح تنقید کا ڈھنگ بھی وقت کیساتھ
بدلتا رہتا ہے۔ چنانچہ تنقید میں "ادب برائے ادب" کے نظریہ
کا چرچا ہوا تو بعض نقاد تذکرہ نگاری کی اہمیت سے بھی انکار کرنے
لگے۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ ہر ادبی تصنیف بجائے خود ایک جامع
حقیقت ہے۔ اس کی خوبیوں اور خرابیوں کا استخراج اسی تصنیف
کے بطن سے کرنا چاہیئے۔ اور اسے سمجھنے یا پرکھنے کے لیئے

کا پیٹ چاک کرنا ضروری نہیں ہے۔ کوئی کتاب کب لکھی گئی
کس نے لکھی؟ کیوں لکھی؟ یہ سب لاتعلق باتیں ہیں۔ جن پر توجہ دینا
تضیع اوقات ہے۔ ہر چند یہ جاذب لیکن سطحی نظریہ بھی اپنی طبعی موت
مر چکا ہے۔ لیکن ادبی مطالعہ کے مروجہ اسالیب و طرائق میں اس کے
اثرات بہت حد تک باقی ہیں۔ اس کا ایک بین ثبوت یہ ہے کہ
ادبی محقق کسی تصنیف کے متن کی تصحیح و تفسیر، تشریح اور تفہیم
آناً سر کھپاتے ہیں۔ کہ نہ مصنف کے دل و دماغ کا تجزیہ انہیں لبھاتا
ہے۔ اور نہ ان سماجی اور معاشرتی محرکات پر ان کی نظر پڑتی ہے جو
ہر مصنّف کی مخصوص ادبی شخصیت کی تخلیق کرتے ہیں۔ ہر اجنبی اصطلاح
اور نامانوس ترکیب کی تحقیق و تفتیش کیلئے اسناد کی تلاش ہوتی ہے
لُغت کی کتابوں کو کھنگالا جاتا ہے۔ جملہ دستیاب نسخوں کا تطابق

قابل کیا جاتا ہے۔ لیکن عام طور سے کسی مصنف کی ذہنی اور قلبی
واردات کے سرچشموں کی تحقیق اور دریافت میں اس کاوش سے کام
نہیں لیا جاتا۔ چاہئے یہ کہ مصنف کی ذات کے اجنبی گوشوں اور
اس کی شخصیت کی غیر معروف گہرائیوں کی تحقیق بھی اسی ڈھنگ سے
کی جائے۔ ظاہر ہے کہ اس تحقیق میں ان تمام سماجی اور اجتماعی مظاہر
اور عوامل کا مطالعہ بھی شامل ہوگا۔ جو ہر انفرادی شخصیت کی تکمیل
کرتے ہیں۔

اس اعتبار سے "روزگار فقیر" محض ایک دلچسپ
تصنیف ہی نہیں۔ قابل قدر بھی ہے۔ غالباً اب یہ ثابت کرنیکی
ضرورت باقی نہیں۔ کہ علامہ اقبال مرحوم ہمارے دور کی سب سے
عظیم اور سب سے عظیم المرتبت ادبی شخصیت تھے۔ لیکن یہ کہنا بھی

غالباً غلط نہ ہوگا۔ کہ ہر چند مرحوم کے متعلق تنقیدی ادب کا ایک ذخیرہ
جمع ہو چکا ہے۔ ان تصنیفات میں شاعر مشرق کی ذات شاذ ہی دکھائی
دیتی ہے۔ بیشتر لکھنے والوں نے اپنا زور قلم اقبالؒ کے فلسفیانہ عقاید
اور تعلیمات کی تفسیر و تشریح پر صرف کیا ہے۔ اور اقبال کے شعر میں
بھی اقبال کی ذات کو دیکھنے کی کوشش نہیں کی!

"روزگار فقیر" حیات اقبال کا جامع تذکرہ نہیں ہے
اس میں شاعر مشرق کی شخصیت یا اس شخصیت کے کسی پہلو کا تفصیلی تجزیہ
کیا گیا ہے۔ اس کی نوعیت ایک سیّاح کی ڈائری کی سی ہے۔ جو
کبھی کسی دلکش وادی میں سے گزرا ہو۔ اور کئی برس بعد فرصت کے
اوقات میں اس حسین سفر کی بسری ہوئی یادوں کی شیرازہ بندی کرنا
چاہے۔ کسی دلفریب صبح کی ایک جھلک کسی دلکش شام کا ایک

طرح ہوا میں اڑتا ہوا ایک خزاں رسیدہ پتا یا جنگل میں سر جوڑے
ہوئے ہزاروں تناور درخت گھاس پر جگمگاتا ہوا شبنم کا اکلوتا موتی
یا شفق میں ڈوبی ہوئی کوئی وسیع اور زرخیز جھیل، چھوٹی اور بڑی باتیں،
فطرت کے حقیر اور عظیم مناظر، واضح مبہم، نیم مبہم یادیں جو بھی سیاح
کے ذہن میں محفوظ ہے۔ اس نے بلا کم و کاست لکھ دیا ہے۔ ان نگارشات
کا تسلسل اس کی اپنی یاد کا تسلسل ہے۔ یادہی کی دھوپ چھاؤں میں
مصنف کے ممدوح کے نقوش کبھی روشن، کبھی دھندلے دکھائی
دیتے ہیں ——

اگر ایک سیاح کی ڈائری کے بجائے یہ کتاب ایک
سائنس دان کا تحقیقی مقالہ ہوتی۔ تو ہم اس میں یقیناً جمادات اور
نباتات کے تفصیلی بیان کی توقع کرتے۔ اس میں معدنیات کے

ذخائر کا ذکر ہوتا۔ دریاؤں، لہروں، چشموں اور جھیلوں کی تفصیل ملتی ذرائع آمدورفت کی وضاحت کیجاتی۔غرض سائنس دان ہر ذرہ اور ہر پتہ کا دل چیر کر ہمیں دکھاتا۔لیکن سیّاح کا یہ کام نہیں ہے۔اس کی تصنیف کا حسن اور سُود مندی محض اسکے اپنے تاثرات کے خلوص اور صحت پر منحصر ہے۔اور "روزگار فقیر" میں یہ خوبیاں بدرجہ اتم موجود ہیں.

روائتی تذکرہ نگار اپنے موضوع سے کبھی ہار نہیں مانتے! کسی کا مرقع حیات بناتے وقت اگر کسی بارہ میں مصدقہ مواد یا معلومات کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جائے۔تو وہ کھینچ تان کے اپنے ذہن سے یہ کمی پوری کر لیتے ہیں۔تذکرہ کو بھاری بھرکم بنانے کے لئے وہ اپنے ممدوح کے محاسن و معائب کے متعلق توضیحوں اور توجیحوں کے

وقریا تنقید و تجزیہ کے طومار اس شدہی سے پھیلائے ہیں
تذکرہ نویس کی اپنی ذات موضوع تذکرہ سے زیادہ اہم دکھائی
دینے لگتی ہے۔ "روزگار فقیر" میں یہ بات نہیں ہے مصنف
نے اقبال مرحوم کو پہلی دفعہ بچپن میں دیکھا تھا —— ہر چند
برسوں بعد تک مرحوم سے انکی ملاقات رہی لیکن اپنی کتاب میں انہوں
نے شروع سے آخر تک بچپن ہی کے مخصوص تحیّر، ادب اور نیاز مندی
کا انداز قائم کر رکھا ہے۔ یہی خلوص اور انکسار "روزگار فقیر" کو
اپنی نوع کی دوسری کتابوں سے ممیز کرتا ہے۔ "روزگار فقیر" میں مصنف
نے زبان اور طرز بیان میں بھی اسی انداز کی رعایت ملحوظ رکھی ہے۔ اور
سادگی کو تصنع اور بے ساختہ روزمرہ کو مغلق، لفظی آرائش و زیبائش
پر ترجیح دی ہے۔ چنانچہ پڑھنے والے کو "روزگار فقیر" سے کوئی

ہو سکتا ہے۔ تو وہی جو مصنف کو خود اپنی ذات سے ہے۔ یعنی
ان کی یادداشت کا گنجینہ زیادہ بھرپور کیوں نہیں ہے۔ اور انہوں
نے اپنی یادوں کو وقت اور فراموش گاری کی دست برد سے
بچانے کی بہت پہلے کوئی تدبیر کیوں نہیں کی۔ یہ گلہ ایک طرح اس
کتاب کی دلچسپی اور افادیت کا اعتراف بھی ہے۔ اس لیے کہ کوئی
داستان کی شکایت، حکایت کے لذیذ ہونے پر دلالت کرتی
ہے۔ اس لذت کے علاوہ جب تذکرہ اور سیرت کے ماہرین معلومات
کا ریزہ ریزہ جمع کر کے حیاتِ اقبال کا لفظی قالب تیار کرنے بیٹھیں گے
اس تصنیف کو بہت مفید پائیں گے۔ اس تصنیف میں اقبال کی
زندگی کے گھریلو روزمرہ مناظر، ان کی نجی صحبتیں اور رنجشیں، راحتیں
کلفتیں ... کے دل کا گداز اور دماغ کی شگفتگی، اقبال کے ...

اقبال کے قہقہے سبھی شامل ہیں۔ یہ بکھرے بکھرے اور غیر مکمل

ن ان کی تکمیل اور ترتیب کچھ ایسا مشکل کام نہیں۔

"روزگارِ فقیر" کے مصنف کا تفصیلی تعارف خود اس

ب کے صفحات میں موجود ہے۔ یہاں غالباً صرف یہ کہنا کافی ہوگا

وہ لاہور کے معروف خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس خاندان میں علم

کا چرچا کئی پشتوں سے چلا آتا ہے۔ اس گھرانے سے اقبال

م کے مراسم ہی اس بات کے شاہد ہیں۔

کرنل وحیدالدین صاحب کے بیشتر ایام سرکاری ملازمت

گزرے ہیں لیکن یہ تصنیف گواہ ہے کہ اپنے آبائی ورثے

محروم نہیں۔ مصنف نے اس کتاب کی تمام آمدنی تنا

دوسرے الفاظ میں انہوں نے اس تصنیف کے قارئین کو لذت
ومعلومات کے علاوہ ایک کارِ خیر میں شرکت کا ثواب بھی بہم پہنچایا
ہے۔ "داناۓ راز" کے عقیدت مندوں میں یہ کتاب یقیناً قبول
ہوگی۔

فیض احمد فیض

۲۰ جولائی سنہ ۱۹۵۰ء

شرفِ حضور!

شاعرِ مشرق سے میری نیاز مندی کی کہانی ۱۹۱۶ء سے شروع ہوتی ہے۔ یہ اندنوں کی بات ہے جب ملکی فضا پر پہلی عالمگیر جنگ کا خونی کہرا سا چھایا ہوا تھا۔ لیکن اس کہر سے میں پے بہ پے بجلی کوند رہی تھی۔ اس بجلی کی دمک سے کبھی روم و شام کے کہساروں میں بہتا ہوا خونِ مسلماں جگمگا اٹھتا تو کبھی ہند میں اپنے طوق و زنجیر جھنجھنانے لگتے،

میں جب علیگڈھ کالج میں پڑھتا تھا۔ تیرہ چودہ برس کا سن ہوگا۔ شعوری طور پر نہ مجھے اس کہرے کا احساس تھا۔ نہ ان

بجلیوں سے شناسائی لیکن اسی زمانے میں میری کور بیں نگاہیں اس صاحب کمال سے متعارف ہوئیں جس نے ان بجلیوں کو اپنے خرمنِ فکر میں محفوظ کر رکھا تھا۔

کالج چند دنوں کے لئے بند تھا۔ میں چھٹی گزارنے لاہور پہنچا۔ حُسنِ اتفاق سے میرے والد مرحوم بھی سرکاری ملازمت سے چند دن کی رخصت پر گھر تشریف لے آئے۔ ان دنوں بچوں کو نہ صرف بزرگوں کی صحبت میں نشست و برخاست کی عام اجازت تھی۔ بلکہ بعض اوقات انہیں ایسی محفلوں میں شرکت پر مجبور کیا جاتا تھا۔ چنانچہ والد محترم کے بیشتر احباب سے میری روشناسی تھی۔ ان میں مولوی احمد دین ایڈووکیٹ۔ سید محمد شاہ صاحب، شیخ گلاب دین وکیل اور علامہ اقبال مرحوم خاص طور

سے قابلِ ذکر ہیں۔

ان دنوں زندگی فراغت سے اتنی عاری اور کشاکش ایام سے ایسی بھرپور نہ تھی۔ جیسی کہ اب ہے۔ احباب یکجا ہوتے تو گھنٹوں محفل جمی رہتی۔ صبح بیٹھتے تو شام تک ہر سبک اور گراں موضوع پر سیر حاصل گفتگو کرتے۔ بیچ میں کوئی شگفتہ مضمون آن پڑتا۔ تو بھاٹی دروازہ میں ہمارے آبائی مکان کا دیوان خانہ بلند اور مسلسل قہقہوں سے گونج اٹھتا۔

مجھے گھر آئے دو دن گزرے تھے۔ سہ پہر کا وقت تھا ملازم نے آکے کہا "ابا بلا رہے ہیں"

والد صاحب کے قریب ایک صاحب تشریف فرما تھے۔ دراز قد۔

والد بزرگوار نے کہا " یہ میرا دوسرا لڑکا ہے۔ "!

صوفہ نشین صاحب نے میرے سر پہ ہاتھ پھیرا۔ اور مجھے شفقت سے اپنے پاس فرش پر بٹھا لیا۔ یہ علامہ اقبال مرحوم سے میری پہلی ملاقات تھی۔

اس زمانہ میں اقبال مرحوم خوش رو اور خوش زیب نوجوان تھے۔ عام طور پہ بڑھیا انگریزی لباس پہنتے۔ لیکن ہمارے ہاں آتے اور طویل صحبت کا سامان ہوتا۔ تو سوٹ اتار کے دھوتی پہن لیا کرتے۔ اور واپسی پہ دوبارہ سوٹ پہن لیتے۔ لباس سے مستقل بے اعتنائی انہوں نے چند سال بعد اختیار کی جب وہ میکلوڈ روڈ والے مکان میں اٹھ آئے تھے۔ اس کے بعد میں نے انہیں دھوتی اور بنیان کے علاوہ کسی اور ملبوس میں کم دیکھا ہے

ڈاکٹر صاحب نے مجھسے کالج کے متعلق مختلف سوالات
پوچھنا شروع کئے جنکا میں اناپ شناپ جواب دیتا رہا۔ اس
لئے کہ خود میرے دل میں بہت سے سوالات پوچھنے کے لیے
گدگدی ہو رہی تھی۔ ان دنوں لوگ انگلستان کے سفر کو عجب رشک
اور استعجاب کی نظر سے دیکھتے تھے۔ اور کھاتے پیتے گھرانوں کے
نوجوانوں کو تو دن رات انگلستان ہی کے خواب آیا کرتے۔ میری بھی
بہت دنوں سے یہی کیفیت تھی۔ علامہ مرحوم کے فکر و کلام کی
عظمت کا تو کس کا ذکر کا اندازہ تھا۔ کوئی تجسس تھا تو یہی کہ ان سے
انگلستان کے قصے سنیں۔ پے در پے جانے کتنے سوال کر ڈالے
وہ ہر ایک کا مسکرا کر جواب دیتے رہے۔ ضبط نہ ہو سکا تو میں نے
یہ بھی کہہ دیا۔ کہ "انگلستان پہنچکر لوگ اپنے نام فرنگیانہ بنا لیتے ہیں

آپ کو بھی چاہیئے تھا۔ کہ اپنا نام A.K.Ball، رکھ لیتے۔ "ڈاکٹر صاحب نے بلا تامل جواب دیا۔ بھئی ہم نے تو نہیں کیا لیکن تم ولایت جاؤ گے تو اس نسخہ پر ضرور عمل کرنا۔ اور اپنا نام W.A.Heed، رکھ لینا"! میں اس جواب سے کچھ لاجواب سا ہو گیا۔ اور تھوڑی دیر کے بعد کسی بہانہ سے کھسک آیا۔

اس پہلی ملاقات کے بعد علامہ مرحوم کو اکثر اپنے ہاں رونق افروز ہوتے دیکھا۔ اگر والد لاہور میں موجود ہوں تو شاید ہی کوئی دن جاتا ہو گا۔ کہ اقبال ہمارے ہاں تشریف نہ لاتے ہوں۔ یا والد ان کے ہاں نہ جاتے ہوں۔ اس لئے کہ ان بزرگوں کی دوستی محبت اور رفاقت کے اس مقام پر پہنچ چکی تھی۔ جہاں من و تو کے بیشتر حجابات اٹھ جاتے ہیں۔ جذباتی الجھنیں ہوں۔ یا گھریلو مسائل

ماضی کا کوئی دُکھ ہو، یا مستقبل کا کوئی اندیشہ، ہنگامۂ شادی ہو
یا سانحۂ غم، گزرا ہوا تجربہ ہو یا آنے والی مشکل ہر بات میں باہمی اشتراک
او مشورت کو دخل تھا۔ یہی وجہ ہے کہ یہ دوست آپس میں ملتے تو
ان کی طویل صحبتیں کچھ بہتے ہوئے پانی کا سا عالم یا دلاتیں کبھی
سُست خرام اور پُرسکوت۔ کبھی پُرشور اور طوفانی۔ خامشی کے لمبے
وقفوں کے بعد کبھی نہایت متین اور سنجیدہ گفتگو کی ہلکی ہلکی لہریں
جنبش میں آتیں تو کبھی بذلہ سنجی اور لطیفہ بازی کا ایسا غلغلہ بلند ہوتا
کہ سارا گھر گونج اٹھتا۔ ان صحبتوں کی کیفیت میرے ذہن میں محفوظ
ہے۔ لیکن افسوس کہ انکی تفصیل محو ہو چکی ہے۔ اتنا یاد ہے۔ کہ گفتگو
کے دوران میں میں جب کبھی باری تعالیٰ یا رسول مقبول صلی اللہ علیہ
وسلم کا ذکر آتا۔ تو علامہ مرحوم پر یکایک ایک وجدان سا طاری ہو جاتا

اس موقع پر عام طور سے وہ آبدیدہ ہو کر خاموش ہو جاتے۔

علامہ مرحوم سے ہمارے خاندانی مراسم کی ابتدا اصل
میں میرے درویش سیرت نانا فقیر سید افتخار الدین کے وسیلہ سے
ہوئی۔ اقبال مرحوم اوائل عمر میں انہیں ملے۔ لیکن جب
بھی شاعر مشرق کے حال میں ان کا مستقبل درخشاں تھا جس سے
نانا مرحوم نہایت متاثر ہوئے۔ اسی توسط سے والد مرحوم سے رسم و راہ
شروع ہوئی۔ جو بعد میں ان مدارج پر پہنچی جنکا ذکر کر چکا ہوں
اور امور کی طرح میری تعلیم کے بارہ میں بھی والد مرحوم
اپنے حبیب عزیز ہی سے رجوع فرمایا کرتے۔ چنانچہ جب اسکول
سے فارغ ہو کے میں نے انگلستان جانے کی رٹ لگائی۔ تو
حسب معمول ڈاکٹر صاحب سے مشورہ طلب ہوا۔ انہوں نے کہا

کہ یہاں تعلیم مکمل کرنے سے پہلے انگلستان کی خاک چھاننا بے سُود ہے۔ ان کی رائے کا احترام اسقدر تھا۔ کہ میرا شدید اصرار خاک بھی کام نہ آیا۔

والد مرحوم ڈاکٹر صاحب کی محبت کو مکتب و مدرسہ سے کہیں بہتر تعلیم گردانتے تھے۔ چنانچہ ایک دفعہ رخصت پر آئے۔ تو مجھے ہدایت فرما گئے۔ کہ تمہارا پڑھنے میں جی نہیں لگتا۔ تو مت پڑھو لیکن یہ وعدہ کرو کہ ہر روز ڈاکٹر اقبال کے گھر صبح سے شام تک حاضر رہا کرو گے اور ان کی گفتگو کو گہرے غور سے سنا کرو گے۔" وعدہ تو کرنے کو میں نے کر لیا۔ لیکن شومئی قسمت کہ اسے پورا کرنے کی سعادت میسر نہ ہوئی۔

چند ہفتوں کے بعد والد دوبارہ لاہور تشریف لائے۔ اور

مجھے اپنے ہمراہ ڈاکٹر صاحب کے ہاں لے گئے۔ ڈاکٹر صاحب جب انارکلی میں مقیم تھے مختصر سا مکان تھا۔ سیڑھیاں چڑھ کر ایک بخارچہ تک پہنچے۔ سامنے ڈاکٹر صاحب کا سادہ سا ڈرائنگ روم تھا۔ اور اس سے ملا ہوا استراحت کا کمرہ۔ اگر میرا حافظہ غلطی نہیں کرتا۔ تو جب ہم باپ بیٹا ڈاکٹر صاحب کے ہاں پہنچے تو ایک دو صاحب عاشق بٹالوی ان کے پاس بیٹھے تھے۔ میں اعتراف جرم پہلے ہی سے کر چکا تھا۔ علیک سلیک کے بعد والد صاحب نے فرمایا" اقبال میں جاتے ہوئے اسے ہدایت کر گیا تھا۔ کہ ہر روز تمہارے پاس آیا کرے لیکن اب معلوم ہوا کہ یہ نالائق ایک دفعہ بھی تمہارے پاس نہیں پہنچا" ڈاکٹر صاحب بولے۔" بھئی فقیر آخر جو کام باپ نے نہ کیا ہو۔ وہ بیٹا کیوں کرے" اس پہ طویل قہقہہ

پڑا لیکن مجھے محسوس ہوا کہ ڈاکٹر صاحب کی ہنسی میں کچھ دوستانہ شکوہ کی ملاوٹ بھی تھی۔

ابتدائی ملاقاتوں کے بعد مجھے علامہ اقبال کی ذات سے اتنا لگاؤ ضرور ہو گیا تھا۔ کہ والد جب بھی گھر پر آتے تو عام طور سے علامہ مرحوم کا تذکرہ رہتا۔ کبھی ہم پوچھتے۔ کبھی وہ خود ہی بیان کرتے۔ بیشتر واقعات جو میں نے اس زمانہ میں والد مرحوم سے سُنے ہیں۔ شاعرِ مشرق کی شخصیت کا ایک پہلو زیادہ اجاگر کرتے ہیں۔ یہ پہلو سوز و گداز اور جذب و وجدان کا پہلو ہے۔

ایک واقعہ مجھے اب تک یوں یاد ہے۔ جیسے اسی گھڑی سننے میں آیا ہو۔ ایک شام والد صاحب علامہ مرحوم کے ہاں سے لوٹے اور آتے ہی یہ عجیب حکایت بیان کی۔

"یک عجیب بات سنو۔ کل صبح میں اقبال کے ہاں
گیا تو وہ گویا میرے منتظر بیٹھے تھے۔ دیکھتے ہی کھل گئے۔ اور کہا
اچھا ہوا فقیر تم آ گئے۔ سنا ہے کہ داتا گنج بخشؒ کی درگاہ میں
آجکل کوئی بہت روشن ضمیر بزرگ قیام رکھتے ہیں۔ ان سے ایک
سوال کا جواب چاہتا ہوں۔ سوال یہ ہے۔ کہ جب مسلمانوں سے یہ
وعدۂ ایزدی ہے۔ کہ وہ اقوام عالم میں سرفراز اور سربلند ہوں گے
تو آجکل یہ قوم اتنی ذلیل و خوار کیوں ہے؟ اچھا ہے تم بھی ساتھ چلو۔
اکیلے یہ زحمت کون کرے" میں نے ہامی بھر لی۔ اور چلنے کی تیاریاں
شروع ہوئیں۔ علامہ مرحوم ہاتھ پاؤں ہلانے میں ہمیشہ بہت تامل
کرتے تھے۔ دو قدم چلنا ہو تو اس کے لئے گھنٹوں پہلے تیاری کی
ضرورت پڑتی تھی۔ چنانچہ داتا گنج بخشؒ کے سفر کا فیصلہ ہوتے

ہی انہوں نے علی بخش کو آواز دی - اور کہا دیکھو ہم باہر جا رہے ہیں - ذرا جلدی سے فقیر کے لئے حقہ بھرو - اور بھاگ کر کچھ سودا لیمن وغیرہ لے آؤ - اس اہتمام میں حسب معمول جانے کتنا وقت نکل گیا - جب صبح سے دوپہر ہو گئی تو میں نے کہا - بھئی اقبال تمہارا کہیں جانے والے کا ارادہ تو ہے نہیں - یونہی وقت ضائع کر رہے ہو - میں تو اب گھر چلا - اقبال اس پہ کچھ چونک سے پڑے - اور کہا ہاں بھئی اب تو واقعی دھوپ تیز ہو گئی ہے - تم جانا چاہتے ہو - تو جاؤ لیکن یہ وعدہ کرو کہ شام کو ضرور آؤ گے - کچھ بھی ہو ہمیں ان بزرگ کے پاس ضرور جانا ہے - میں وعدہ کر کے چلا آیا - سہ پہر کو پھر پہنچا - لیکن پھر اسی طرح حقہ اور سودا لیمن میں دن ڈھل گیا - میں نے اقبال سے اس تساہل کا شکوہ کیا تو اقبال بہت ہی انکسار سے کہنے لگے

بھئی اس دفعہ او معاف کرو صبح ضرور چلیں گے"۔

اگلی صبح میں عمداً دیر سے پہنچا۔ کوئی گیارہ بجے کا وقت ہو گا۔ اقبال کو دیکھا تو انکی عجیب کیفیت تھی۔ رنگ زرد چہرے پہ ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ تفکر اور اضطراب کا یہ عالم کہ جیسے کوئی شدید سانحہ گزر گیا ہو۔ میں نے پوچھا خیر تو ہے؟ کہنے لگے فقیر میرے قریب آ کر بیٹھو۔ تو کہوں! آج صبح میں یہیں بیٹھا تھا۔ کہ علی بخش نے آ کے اطلاع دی کہ کوئی درویش صورت آدمی ملنا چاہتا ہے۔ میں نے کہا بلالو۔ ایک درویش صورت اجنبی میرے سامنے خاموش آ کھڑا ہوا۔ کچھ وقفہ کے بعد میں نے کہا فرمایئے؟ آپ کو مجھ سے کچھ کہنا ہے۔ اجنبی بولا۔ "ہاں تم مجھ سے کچھ پوچھنا چاہتے تھے میں تمہارے سوال کا جواب دینے آیا ہوں۔" اور اس کے بعد مثنوی کا مشہور

شعر پڑھا۔ ؎

گفت رُومی ہر بنائے کہنہ کاباداں کنند

تو بنائی اوّل آں بُنیاد را ویراں کنند

کچھ پُوچھو نہیں کہ مجھ پر کیا گزر گئی۔ چند لمحوں کے لئے مجھے

قطعی اپنے گرد و پیش کا احساس جاتا رہا۔ ذرا حواس ٹھکانے ہوئے

تو بزرگ سے مخاطب ہونے کے لئے دوبارہ نظر اٹھائی۔ لیکن وہاں

کوئی بھی نہ تھا۔ علی بخش کو ہر طرف دوڑایا لیکن کہیں سراغ نہیں ملا!

والد مرحوم نے یہ واقعہ پہلے مجھے اور دوبارہ ایک دفعہ میرے

پرلے دوست عاشق بٹالوی کو سنایا تھا اور عاشق صاحب نے

اسکی صحت کے متعلق ڈاکٹر صاحب سے تصدیق بھی کی تھی۔

والد مرحوم نے ایک مرتبہ ڈاکٹر صاحب کے متعلق ایک

اور واقعہ سنایا۔ کہنے لگے میں ایک دن ڈاکٹر صاحب سے ملنے گیا۔ تو کیا دیکھتا ہوں۔ اکیلے بیٹھے زار و قطار رو رہے ہیں۔ میں نے کہا خیر باشد! گھر میں تو سب لوگ بخیر و عافیت ہیں؟ انہوں نے جواب دیا۔ ہاں سب بخیریت ہیں۔ میں نے پوچھا۔ تو پھر آپ اس طرح کیوں رو رہے ہیں؟ ڈاکٹر صاحب نے جواب دینے کی بجائے میری طرف ایک خط بڑھا دیا۔ جو لندن سے اسی دن ان کے نام آیا تھا۔ یہ خط انگلستان کے ایک پروفیسر[1] کی طرف سے تھا۔ جس نے ڈاکٹر صاحب سے ان کی ایک فارسی کتاب کا ترجمہ کرنے کی اجازت مانگی تھی۔ میں نے تعجب سے کہا۔ اس خط میں ایسی کونسی

---

[1] کیمبرج یونیورسٹی کے معلم شرقیات پروفیسر نکلسن جنہوں نے "اسرار خودی" کا انگریزی ترجمہ کیا ہے۔

بات ہے۔ کہ تم نے یُوں رونا شروع کر دیا؟ تمہیں تو خوش ہونا چاہیے
کہ دُوسرے ملکوں کے اہل علم تمہارے کلام کو قدر کی نگاہوں سے دیکھتے
ہیں اور یورپ کے لوگوں کو بھی اس سے آشنا کرنا چاہتے ہیں۔
ڈاکٹر صاحب نے جو اس وقت تک برابر سر جھکائے بیٹھے تھے۔ سر اٹھا
کے میری طرف دیکھا۔ اور پھر کہنے لگے۔ مجھے اس بات پر رونا آگیا۔ کہ
جس قوم کے دل میں احساسِ خودی پیدا کرنے کے لئے میں نے
یہ کتاب لکھی تھی وہ نہ تو پُوری طرح اس کا مطلب سمجھ سکتی ہے۔ اور نہ
اس کی قدر کر سکتی ہے۔ دوسری طرف ولایت والوں کا یہ حال ہے۔
کہ وہ میرے پیغام کو اپنے ملک کے لوگوں تک پہنچانا چاہتے ہیں
حالانکہ میں نے یہ کتاب ان کے لئے نہیں لکھی۔

والد مرحوم سے ڈاکٹر صاحب کو بے حد محبت تھی۔ چنانچہ وہ

جب والد مرحوم سے گفتگو کرتے تھے تو اس کا انداز کچھ ایسا بے تکلفانہ ہوتا تھا جس میں بے گانگی کا شائبہ تک پایا نہیں جاتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کی طبیعت میں ظرافت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ عام محفلوں میں گفتگو کرتے وقت کوئی لطیفہ پھبتی۔ یا چبھتا ہوا جملہ ایسا کہہ جاتے تھے۔ کہ خشک سے خشک بحثیں بھی بامزہ معلوم ہونے لگتیں۔ بے تکلف دوستوں کے ساتھ جب گفتگو ہوتی۔ تو اسکا رنگ ہی اور ہوتا۔ کبھی ان کی طبیعت لہراتی۔ تو ایک آدھ فقرہ۔ کوئی پھبتی کہتے والد مرحوم کو اُکساتے۔ وہ پہلے تو کچھ دیر ضبط کیے بیٹھے رہتے۔ فقرے اور پھبتیاں سنتے اور ہنس کے چپکے ہو رہتے لیکن آہستہ آہستہ ان پر بھی یہی رنگ چھا جاتا۔ اور وہ بھی خوش طبعی پر اتر آتے کبھی کبھی تو یہ نوک جھونک اس حد تک اعتدال کا پہلو لیتے ہوتی۔ کہ ہم ایسے نیازمند

بھی اس سے لُطف اٹھاتے لیکن جب خوش طبعی اور بے تکلفی کا
رنگ ذرا تیز ہو جاتا۔ تو مجھے اس محفل سے اٹھ جانا پڑتا یا یُوں کہنا چاہیئے
کہ اٹھا دیا جاتا تھا۔

ڈاکٹر صاحب کو قدرت نے عظمت کے جس بلند ترین
مقام پر پہنچایا تھا۔ اس کا حال آپ جانتے ہیں لیکن اس کے باوجُود
وہ دُوسروں کی تعریف کرنے میں کبھی بخل سے کام نہیں لیتے تھے
تھے۔ خاص طور پر اپنے بے تکلف دوستوں کی خُوبیوں کا ذکر تو اکثر
موقعوں پر کرتے رہتے تھے۔ والد مرحُوم کو مطالعہ کا بڑا شوق تھا۔ اور
اسلامی تاریخ سے تو وہ خاص طور پر بڑا شغف رکھتے تھے چنانچہ کبھی
مطالعہ خصوصاً اسلامی تاریخ کے مطالعہ کا ذکر آتا تھا۔ تو وہ بڑے فخر
سے کہا کرتے تھے۔ کہ اقبال جب کسی سے میرا تعارف کراتا ہے تو

یہ بات خاص طور پر کہتا ہے۔ کہ میرے دوست فقیر سید نجم الدین اسلامی تاریخ پر بڑی وسیع نظر رکھتے ہیں۔

شروع کے اوراق میں اس بات کا ذکر کر چکا ہوں۔ کہ ڈاکٹر صاحب کا دل عشقِ رسول سے گداز کر رکھا تھا۔ زندگی کے آخری زمانہ میں تو یہ کیفیت ہو گئی تھی۔ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر آجاتا تھا۔ تو ڈاکٹر صاحب کی آنکھوں سے آنسو بہ نکلتے تھے۔ جب ڈاکٹر صاحب راؤنڈ ٹیبل کانفرنس سے واپس آئے۔ تو والد محترم ان سے ملنے گئے۔ بڑی مدت کے بعد ایک دوسرے سے ملاقات ہوئی تھی۔ اس لیئے بڑے تپاک سے ملے۔ اور ڈاکٹر صاحب سے ان کے سفر کے تجربات کے متعلق گفتگو ہونے لگی۔ والد مرحوم نے اثنائے گفتگو میں کہا۔ "اقبال تم یورپ ہو آئے۔ مصر اور

فلسطین کی سیر بھی کی۔ کیا اچھا ہوتا۔ کہ واپسی پر روضۂ اطہر کی زیارت سے بھی آنکھیں نورانی کر لیتے"۔ یہ سنتے ہی ڈاکٹر صاحب کی حالت دگرگوں ہوگئی یعنی چہرے پر زردی چھا گئی۔ اور آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ چند لمحے تک یہی کیفیت رہی۔ پھر کہنے لگے۔ "فقیر میں کس منہ سے روضۂ اطہر پر حاضر ہوتا؟"

شروع شروع میں میں والد مرحوم کی ہدایت کے باوجود ڈاکٹر صاحب سے دور رہا۔ البتہ جب کبھی ان کی خدمت میں حاضر ہوتا۔ ڈاکٹر صاحب کا ذکر چھڑ جاتا۔ وہ ڈاکٹر صاحب کی زندگی کے دلچسپ واقعات سناتے۔ ان کی سادگی۔ خلوص۔ علمی تبحر اور شاعرانہ عظمت کا ذکر کر کے میرے شوق کو برانگیختہ کرتے۔ میں کبھی کبھی ان کی باتیں سن کے سوچتا۔ کہ سچ مچ ڈاکٹر صاحب کی خدمت

میں حاضر ہوئے تو مدتیں ہوگئیں خدا نے چاہا۔ تو انہیں دنوں ان
کی زیارت کروں گا۔ کئی بار اپنے آپ سے اس قسم کا عہد کیا۔ لیکن
اور قصوں میں پڑ کے بھول گیا۔ پھر جب سرشوری اور نادانی کا وہ زمانہ
جسے شباب کا ابتدائی دور کہنا چاہیئے۔ ختم ہوا۔ خیالات میں کسی قدر
پختگی آئی۔ تو دل پر ڈاکٹر صاحب کی عظمت کا نقش زیادہ گہرا ہوتا
گیا۔ طبیعت ان کی طرف خود بخود کھنچنے لگی۔ اور میں نے ان کی خدمت
میں حاضر ہونا شروع کیا۔ چنانچہ کچھ عرصے میں یہ کیفیت ہوگئی۔ کہ جب
کبھی فرصت کا تھوڑا سا وقت ملتا تھا۔ میں ان کی خدمت میں حاضر
ہو جاتا تھا۔ اس "حضوری" میں ایسی لذت پائی کہ جو زمانہ دوری میں بسر
ہوا تھا۔ اس پر افسوس ہوتا تھا۔ اور بار بار خیال آتا تھا۔ کہ اے کاش
ہم نشینی و یکجائی کی یہ سعادت پہلے نصیب ہوئی ہوتی۔

ڈاکٹر صاحب زیادہ تر خاموش رہتے تھے۔ میں نے
جب انہیں دیکھا۔ کچھ نہ کچھ سوچتے ہی پایا۔ اور کبھی کبھی تو انہیں
دیکھ کے ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ ان کی نگاہیں افق کے اس پار بلکہ افلاک
کی حد سے بھی آگے کسی چیز کو تلاش کر رہی ہیں۔ ایسے موقع پر کسی
کو جرأت نہ ہوتی تھی۔ کہ خود گفتگو کا سلسلہ چھیڑے۔ ڈاکٹر صاحب
خیالات میں مستغرق ہوتے تھے۔ اور لوگ چپ چاپ بیٹھے رہتے
تھے۔ یا گفتگو بھی ہوتی تھی۔ تو کچھ اکھڑی اکھڑی یعنی کسی نے
کوئی بات پوچھی۔ اور ڈاکٹر صاحب نے جواب میں ایک آدھ مختصر سا
جملہ کہدیا۔ اور پھر خاموشی چھا گئی لیکن یہ کیفیت ہمیشہ نہیں رہتی تھی۔
جب وہ بحث و گفتگو کی طرف جھک پڑتے تھے۔ تو گھنٹوں مسلسل
باتیں کرتے چلے جاتے تھے۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ خیالات کا

ایک سیلاب ہے۔ جو امڈا چلا آرہا ہے۔

ایک دفعہ ان کی طبیعت ذرا شگفتہ تھی۔ یعنی باتیں کرنے کے "موڈ" میں تھے۔ میں نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کے سوال کیا۔ کہ ڈاکٹر صاحب آپ شعر کیسے کہتے ہیں؟ کہنے لگے تم نے بڑا دلچسپ موضوع چھیڑ دیا ہے۔ لیکن پہلے ایک واقعہ سن لو۔ ایک مرتبہ فارمن کرسچن کالج لاہور کا سالانہ اجلاس ہو رہا تھا۔ کالج کے پرنسپل ڈاکٹر لوکس نے مجھے بھی اس میں دعوتِ شرکت دی۔ اجلاس کا پروگرام ختم ہونے کے بعد چلنے کا بندوبست کیا گیا تھا۔ ہم لوگ چائے پینے بیٹھے۔ تو ڈاکٹر لوکس میرے پاس آئے اور کہنے لگے۔ چائے پی کے چلے نہ جانا مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے ہم لوگ چائے پی چکے۔ تو ڈاکٹر لوکس آئے۔

—— اور مجھے اپنے ساتھ ایک گوشے میں لے گئے۔ پھر کہنے لگے۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں۔ کہ تمہارے نزدیک تمہارے پیغمبر پر صرف قرآن کریم کا مفہوم نازل ہوا تھا۔ اسے اپنی زبان میں منتقل کر لیا؟ یا قرآن کی موجودہ عبارت نازل ہوئی تھی۔ گویا تمہارے عقیدہ میں قرآن کے مطالب الہامی ہیں۔ یا تم اس کے الفاظ کو بھی الہامی سمجھتے ہو؟

میں نے کہا ڈاکٹر صاحب میں تو قرآن کے الفاظ کو بھی الہامی سمجھتا ہوں۔ میرے نزدیک قرآن کی عبارت عربی زبان میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی تھی۔ ڈاکٹر لوکس یہ غیر متوقع جواب سن کر حیران ہو گئے۔ اور بڑے تعجب آمیز لہجہ میں بولے "مجھے حیرت ہے۔ کہ تم ایسا ہوش مند کسی ثبوت کے

بغیر کیونکر اس بات پہ یقین رکھتا ہے؟ کہ قرآن کے الفاظ بھی الہامی ہیں۔

میں نے کہا ڈاکٹر صاحب جب مجھ پہ شعر کہنے کی کیفیت طاری ہوتی ہے۔ تو مجھ پہ ہر شعر نوپا اترتا ہے۔ پھر نبی آخرالزمان پہ جسے خدا نے دنیا کی رشد و ہدایت کے لئے بھیجا تھا۔ قرآن کریم کی پوری عبارت کیوں نازل نہیں ہو سکتی۔ آخر اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔ ڈاکٹر لوکس کو میں نے اس طرز استدلال سے لاجواب کر دیا۔

یہ واقعہ بیان کرنے کے بعد ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ جب میں شعر کہتا ہوں تو مضامین و اشعار کے ہجوم سے میرا ذہن بوجھ سا محسوس کرتا ہے۔ بس یہ سمجھ لو۔ کہ ایک ماہی گیر نے مچھلیاں

پکڑنے کے لیئے جال ڈالا ہے۔ مچھلیاں اس کثرت سے جال کی طرف کھنچی چلی آرہی ہیں۔ کہ ماہی گیر پریشان ہوگیا ہے۔ سوچتا ہے کہ اتنی مچھلیوں میں سے کسے پکڑوں۔ اور کسے چھوڑ دوں؟

میں نے پوچھا۔ "کیا آپ پر یہ کیفیت ہمیشہ طاری رہتی ہے"۔

وہ کہنے لگے "نہیں یہ کیفیت تو مجھ پر سال بھر میں زیادہ سے زیادہ دو بار طاری ہوتی ہے لیکن فیضان کا یہ عالم کئی کئی گھنٹے رہتا ہے۔ اور میں بے تکلفی سے شعر کہتا جاتا ہوں۔ پھر عجیب بات یہ ہے۔ کہ جب طویل عرصہ کے بعد یہ کیفیت طاری ہوتی ہے۔ تو پہلی کیفیت کے آخری لمحات میں جو اشعار کہے تھے ان کی جانب خود بخود ذہن منتقل ہو جاتا ہے۔ گویا اس کیفیت میں ایک قسم کا تسلسل

بھی ہے۔ یا یوں کہنا چاہیئے۔ کہ یہ فیضان کے لمحے دراصل ایک ہی زنجیر کی مختلف کڑیوں کی حیثیت رکھتے ہیں جب یہ کیفیت ختم ہو جاتی ہے۔ تو میں ایک قسم کی تکان۔ عصبی اضمحلال اور پژمردگی سی محسوس کرتا ہوں۔

تھوڑی دیر توقف کے بعد کہنے لگے۔ کہ ایک مرتبہ چھ سات سال تک مجھ پر کیفیت طاری نہ ہوئی۔ تو میں یہ سمجھا کہ خدا تعالےٰ نے مجھ سے یہ نعمت چھین لی ہے۔ چنانچہ اس نہ ملنے میں میں نے نثر لکھنے کی طرف توجہ کی۔ یک بیک ایک روز پھر یہی کیفیت طاری ہوگئی۔ ان لمحوں میں میری طبیعت ایک عجیب لذت محسوس کر رہی تھی۔ بس ایسا محسوس ہوتا تھا۔ کہ اشعار کا ایک بحر موّاج ہے۔ کہ اُمڈا چلا آتا ہے۔ یہ کیفیت سرور و نشاط اتنی دیر تک قائم رہی۔ کہ اس

نے چھ سات سال کے جمود و تعطّل کی تلافی کر دی۔

یہ کہہ کے وہ لمحہ بھر کے لئے رُک گئے۔ ان کے چہرے سے معلوم ہوتا تھا۔ کہ وہ خیالات میں کھوئے ہوئے تھے۔ پھر یکبارگی کہنے لگے۔ مشہور جرمن شاعر گوئٹے کے متعلق ایک کتاب میں لکھا ہوا ہے۔ کہ جب اس نے جرمن زبان میں قرآن کریم کا ترجمہ پڑھا۔ تو اس نے اپنے بعض دوستوں سے کہا۔ کہ میں یہ کتاب پڑھتا ہوں تو میری روح میرے جسم میں کانپنے لگتی ہے۔ اصل بات یہ ہے۔ کہ شاعر کو بھی ایک قسم کا الہام ہوتا ہے۔ اس لئے جب وہ کوئی الہامی کتاب پڑھتا ہے۔ تو اپنی رُوح کو اس کی معنویت سے ہم آہنگ پاتا ہے۔ اور اس کی طبیعت ایک خاص اہتزاز محسوس کرتی ہے۔ یہ چیز دوسرے لوگوں کو نصیب

نہیں ہو سکتی +

ڈاکٹر صاحب کی زندگی کے واقعات میں ان کے "نائٹ ہڈ" کا قصہ بھی بہت دلچسپ ہے۔ جن دنوں انہیں سر کا خطاب ملا۔ پنجاب کی سیاسی فضا خاصی مکدر تھی۔ ترکِ موالات کی تحریک کا زمانہ تھا۔ سودیشی کی تحریک زوروں پر تھی۔ انگریزی مال کے بائیکاٹ کے ساتھ ساتھ لوگ سرکاری ملازمتوں۔ اور خطابات کے بائیکاٹ کو بھی فرضِ عین سمجھتے تھے۔ اس لئے ڈاکٹر صاحب کو خطاب ملا۔ تو ان کے بعض دوست بہت جز بز ہوئے۔ اخباروں میں مضامین چھپے۔ فکاہی کالموں میں۔ ان پر چوٹیں کی گئیں۔ ان دنوں مولینا ظفر علی خان اور سالک و مہر کی اخبار نویسی کے بڑے چرچے

تھے - یہ لوگ اگرچہ ڈاکٹر صاحب کے حلقۂ احباب میں شامل تھے۔
روز نہیں تو دوسرے تیسرے دِن ان کے ہاں ضرور آتے تھے۔
اور گھنٹوں صحبتیں رہتی تھیں۔ لیکن سب سے پہلے انہیں حضرات
نے مخالفت کی - اور سالک صاحب نے تو ایک نظم بھی لکھ ڈالی
جس کا یہ چھپتا ہُوا۔ مصرع " سرکار کی دہلیز پہ سر ہو گئے اقبال" اُن دنوں
اکثر لوگوں کی زبان پر تھا۔ سالک صاحب کا بیان ہے۔ کہ میں یہ اشعار
لکھنے کے بعد اتنا نادم ہُوا - کہ مجھے عرصے تک ڈاکٹر صاحب کی
خدمت میں حاضر ہونے کی جرأت نہ ہوئی۔ لیکن کچھ عرصہ کے بعد
جی کڑا کر کے حاضر ہُوا۔ تو ڈاکٹر صاحب کے انداز میں میں نے کوئی
فرق محسوس نہیں کیا - ایسا معلوم ہوتا تھا - کہ اس قسم کا کوئی واقعہ ہُوا ہی
نہیں۔ مولینا ظفر علی خاں کو بھی اسی طرح ندامت کا احساس تھا۔

لیکن ڈاکٹر صاحب کو اپنے دوستوں کے اس طرزِ عمل پر نہ حیرت تھی۔ نہ افسوس۔ بلکہ وہ یہ مضامین اور اشعار سن سن کے مسکراتے اور کبھی کبھی تو ان اشعار کو پڑھوا کے سنتے اور داد دیتے۔

میں ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں اس خطاب کی مبارکباد دینے حاضر ہوا۔ تو ڈاکٹر صاحب پلنگ پر نیم دراز حقہ پی رہے تھے۔ میں سلام کر کے بیٹھ گیا۔ پہلے مبارکباد دی۔ پھر لوگوں کے اعتراضات کا قصہ چھیڑ دیا۔ کہنے لگے تمہیں شاید معلوم نہیں۔ مجھے یہ خطاب کس طرح ملا۔ جس زمانے میں خطاب کی سفارش ہوئی۔ اس سے پہلے پنجاب کے چیف جسٹس سر شادی لال نے مجھے بلا کے کہا کہ مجھ سے گورنمنٹ نے خطابات کے لئے سفارشیں طلب کی ہیں اور میں تمہارا نام خان صاحب کے خطاب کے لئے تجویز کرنا چاہتا

ہوں۔ میں نے کہا میں اپنے لئے کوئی خطاب نہیں چاہتا۔ آپ زحمت نہ فرمایئے۔ وہ کہنے لگے اس قدر جلد فیصلہ نہ کرو۔ بلکہ پہلے اچھّی طرح غور کرلو۔ میں نے کہا۔ میں غور کرچکا مجھے خطاب کی ضرورت نہیں۔

دو تین دن کے بعد پھر سر شادی لال کا پیغام ملا۔ کہ مجھسے مل جاؤ۔ میں نے پیغام بر کے ہاتھ کہلا بھیجا۔ کہ خطاب کے سلسلہ میں مجھسے گفتگو کرنا بے سُود ہے۔ کیونکہ میں جو فیصلہ ایک بار کرچکا۔ سو کرچکا۔ ہاں اگر کوئی اور بات ہے۔ تو مجھے آپ سے ملاقات کرنے میں کوئی عذر نہیں۔ اس واقعہ کو کچھ دن گزرے تھے۔ کہ میکلگن صاحب گورنر پنجاب نے مجھے بلا بھیجا۔ بڑے تپاک سے ملے۔ اور کہنے لگے۔ آیئے آپ کو اپنے

ایک دوست سے ملواؤں - ایک انگریز انہیں دنوں لاہور آیا تھا۔
اس نے میرا نام سُن رکھا تھا - انگریزی میں اسرارِ خودی کا ترجمہ بھی
پڑھا تھا - وہ گورنمنٹ ہاؤس میں ٹھہرا تھا - اور مجھ سے ملنا چاہتا
تھا - اس نے ایک کتاب بھی لکھی تھی - اُس کے متعلق میری رائے
معلوم کرنا چاہتا تھا - غرض خاصی دیر تک صحبت رہی - جب میں
رخصت ہونے لگا - تو میکلگن صاحب نے کہا - ڈاکٹر صاحب! میں
چاہتا ہوں - کہ آپ کی ادبی خدمات کے صلے میں آپ کے لئے
سر کے خطاب کی سفارش کی جائے - میں نے کہا خطابات اور
اعزازات کے بکھیڑے میں بھی نہیں پڑنا چاہتا - انہوں نے اصرار کیا
تو میں مان گیا - میں نے دیکھا - کہ میرے انکار سے ان کی طبیعت
کسی قدر مکدر ہو گئی تھی - جب میں نے کہا - آپ کو اصرار ہے - تو

اچھا یوں ہی سہی۔ تو ان کے چہرے سے مسرّت جھلکنے لگی۔

ڈاکٹر صاحب کے خطاب پانے کا واقعہ صرف اسی قدر ہے، جسے لوگوں نے بہت طُول دیا۔ اس پر حاشیہ آرائیاں کیں۔ اور اس سارے قصّہ کو اس طرح پیش کیا۔ گویا ڈاکٹر صاحب خطاب پا کے سچ مچ اپنے سیاسی عقاید سے دستبردار ہو گئے تھے۔ برطانیہ کے معاملہ میں ان کی جو رائے خطاب پانے سے پہلے تھی بعد میں بھی وُہی رہی۔ انہوں نے خطاب پانے کے بعد جو نظمیں کہی ہیں۔ ان میں برطانیہ کی حکمتِ عملی پر جا بجا طنز کیا ہے بلکہ طنز کے یہ نشتر پہلے سے زیادہ تیز ہو گئے ہیں۔ ہاں اس سلسلہ میں ایک بات یاد آگئی۔ گورنر پنجاب ڈاکٹر صاحب کے خطاب کے بارے میں گفتگو کر چکے۔ تو کہنے لگے آپ کی نظروں

میں کوئی ایسا مستحق شخص ہے، جسے شمس العلما کا خطاب دیا جاسکے۔ ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا۔ میں اس شرط پر ایک نام پیش کرنے کے لئے تیار ہوں۔ کہ اس کے سوا کسی اور نام پر غور نہ کیا جائے یعنی اس معاملہ میں میری رائے قطعی اور حتمی سمجھی جائے۔ شرط بہت کڑی تھی۔ اس لئے میکلگن صاحب نے پہلے تو کسی قدر تامل کیا۔ لیکن پھر راضی ہو گئے۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا۔ میرے نزدیک مولوی میر حسن صاحب پروفیسر مرے کالج سیالکوٹ سے زیادہ کوئی شخص اس خطاب کا مستحق نہیں۔ میکلگن صاحب بولے میں نے ان کا نام پہلی مرتبہ آج ہی سنا ہے۔ اچھا یہ بتائیے؟ انہوں نے کون کونسی کتابیں لکھی ہیں؟ ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا۔ کہ انہوں نے کوئی کتاب تو تصنیف نہیں کی۔ لیکن میں ان کی زندہ

تصنیف آپ کے سامنے موجود ہوں - گورنر پنجاب لاجواب ہوگئے
اور تجویز کی تائید کرتے ہی بنی -

ڈاکٹر صاحب نے گورنر پنجاب سے اس موقع پر یہ وعدہ
بھی لے لیا تھا - کہ جب خطاب کا اعلان ہو جائیگا - تو مولوی صاحب
کو سیالکوٹ سے لاہور آنے کی زحمت نہیں دی جائیگی - چنانچہ
مولوی صاحب کے خطاب کی سند ان کے صاحبزادے سید
علی نقی شاہ صاحب کو جو گورنمنٹ ہاؤس میں رہتے تھے - لاہور
میں ہی گورنر (میکلگن) موصوف نے عطا کر دی !!

میں جب کبھی اس واقعہ پر غور کرتا ہوں - تو حیرت ہوتی
ہے - کہ اللہ اللہ ! ڈاکٹر صاحب کتنے بلند کردار اور شریف النفس
شخص تھے - کہ اس موقع پر بھی استاد کو نہ بھولے - اب نہ مولوی

میر حسن جیسے استاد ہیں - نہ اقبال جیسے شاگرد - اور پھر ذرا اس
بات پر بھی غور کیجیے - کہ جس زمانے میں یہ واقعہ پیش آیا - اقبال
کی شہرت ہندوستان سے نکل کے یورپ میں پہنچ چکی تھی - دوسرے
ملکوں کے علمی حصّوں میں ان کا نام بڑے احترام سے لیا
جاتا تھا - اور مولوی میر حسن جو پہلے تھے اب بھی وہی تھے - معدودے
چند لوگوں کے سوا جنہیں اُن کی خدمت میں بیٹھنے یا ان سے
پڑھنے کا موقع ملا تھا

پھر بھی اقبال ہمیشہ ان کی عظمت کا اعتراف کرتے
رہے - اور اس معاملہ میں حفظِ مراتب سے غافل نہیں ہوئے -

بات سے بات نکلتی چلی جاتی ہے - ڈاکٹر صاحب
کی شہرت کے تذکرہ کے ضمن میں ایک واقعہ یاد آگیا جس سے

معلوم ہوتا ہے۔ کہ ان کے ہزارہا عقیدت مند دُنیا کے کن
دور و دراز گوشوں میں موجود تھے۔ ایک مرتبہ میں ان کی خدمت
میں حاضر ہُوا۔ وہ پلنگ پر بیٹھے کوئی کتاب پڑھ رہے تھے مجھے
دیکھ کے کتاب بند کر دی۔ اور ادھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں
پلنگ سے ذرا ہٹ کے ایک قالین پڑا تھا جس کی رنگت اور
گل بُوٹے آنکھوں میں کھُبے جا رہے تھے۔ میں نے پُوچھا ڈاکٹر
صاحب آپ نے یہ نیا قالین خریدا ہے۔ کہنے لگے اس قالین
کا قصّہ بھی عجیب ہے۔ آج صبح ایک شخص جسکا میں نام تک نہیں جانتا
یہ قالین لے کے آیا۔ اور کہنے لگا میں دو تین دن ہُوئے فریضۂ حج
ادا کر کے لاہور پہنچا ہُوں۔ ایران کی سیر کا مدّت سے شوق تھا۔
اس لیئے واپسی پر "ایران" کا راستہ اختیار کیا۔ "طہران" میں جن صاحب

کے ہاں میرا قیام تھا۔ انہیں جب معلوم ہُوا۔ کہ میں پنجاب سے آیا ہُوں۔ اور حج کر کے اپنے وطن واپس جا رہا ہُوں۔ تو انہوں نے مجھُ سے پوچھا تم نے کبھی حضرتِ اقبالؔ کو دیکھا ہے؟ میں نے کہا جی ہاں کئی مرتبہ! یہ سُنتے ہی وہ اٹھ کے میری طرف بڑھے میری آنکھوں کو بوسہ دیا۔ اور پھر دیر تک بڑے اشتیاق سے آپ کے حالات پوچھتے رہے۔ جب میں رخصت ہونے لگا۔ تو گھر میں سے یہ قالین نکال لائے۔ اور کہنے لگے۔ کہ لاہور پہنچ کر میری طرف سے یہ قالین ان کی خدمت میں پیش کر دینا۔ یہ قالین آپ کے ایک ایرانی عقیدتمند کا تحفہ ہے۔ جو میں اسکی طرف سے آپکی خدمت میں پیش کرنے حاضر ہوا ہُوں۔

میں یہ سطور لکھ رہا ہوں۔ اور میرے سامنے ایک کتاب پڑی ہے۔ جو سپین کی تاریخ سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کتاب کا نام SPAIN FROM THE SOUTH ہے اور اس کے مصنف کا نام J. B. TREND کتاب کے آغاز میں ڈاکٹر صاحب کے دستخط ہیں۔ اور ان کے نیچے ۲ جنوری ۱۹۳۵ء لکھا ہوا ہے۔ یہ کتاب مجھے ڈاکٹر صاحب نے مرحمت فرمائی تھی۔ اور میں اسے بڑی عزیز متاع سمجھتا ہوں۔ اس کتاب پر نظر پڑتے ہی مجھے یاد آ گیا۔ کہ جب وہ دوسری گول میز کانفرنس سے واپس آئے۔ تو میں والد مرحوم کی معیت میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا — ان دنوں والد مرحوم کے فیض محبت سے مجھ میں اسلامی تاریخ کا خاصا ذوق پیدا ہو چلا تھا۔ سپین کے متعلق میں نے کئی کتابیں جن میں سکاٹ اور لین پال

کی تصانیف شامل تھیں۔ میری نظر سے گزر چکی تھیں۔ میں نے
یہی تذکرہ چھیڑ دیا۔ اور اسپین کے اسلامی عہد کی تاریخ کا ایک
حصہ جو مجھے حفظ ہو گیا تھا۔ فر فر سنا دیا۔ ڈاکٹر صاحب بہت
خوش ہوئے۔ اور یہ کتاب اپنے دستخط ثبت کر کے مرحمت فرمائی
پھر اسپین کی موجودہ حالت کا ذکر چھڑ گیا۔ ڈاکٹر صاحب اپنے سفر
میں سپین بھی گئے تھے۔ اور اسی زمانے میں انہوں نے مسجد قرطبہ
پر ایک نظم بھی لکھی تھی۔ جو ان کی مشہور نظموں میں سمجھی جاتی ہے۔ وہ
جب قرطبہ پہنچے۔ اور وہاں کی مسجد دیکھنے گئے۔ جو انقلاب زمانہ
کی بوقلمونی سے گرجا بن چکی ہے۔ تو انہوں نے ایک پادری سے
جو مسجد کی نگہبانی پر مامور تھا۔ وہاں نماز پڑھنے کی خواہش ظاہر کی
پادری نے یہ سن کے تامل کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا تعجب ہے

تم مسیحی ہم سے اس قسم کا سلوک روا رکھتے ہو؟ حالانکہ ہم نے تم سے کبھی اس قسم کا سلوک نہیں کیا تھا۔ وہ پادری اس فقرہ سے کسی قدر متاثر ہوا۔ اور کہنے لگا۔ آپ یہیں ٹھہریئے۔ میں بڑے پادری سے پوچھ کے آتا ہوں لیکن جب تک وہ واپس آیا۔ ڈاکٹر صاحب نماز پڑھ چکے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے یہ واقعہ سنانے کے بعد کہا۔ تعجب کی بات یہ ہے۔ کہ مسلمانوں نے سپین پر آٹھ سو برس حکمرانی کی لیکن اس سرزمین میں کسی مسلمان کا نشانِ مزار تک نظر نہیں آتا۔

اسی سفر میں وہ اٹلی بھی گئے۔ اور وہاں انہیں مسولینی سے ملنے کا بھی اتفاق ہوا۔ یہ ساری کیفیت میں نے خود ان کی زبانی سنی ہے۔ انہوں نے خود مسولینی سے ملنے کی خواہش ظاہر

نہیں کی تھی۔ بلکہ جن دنوں وہ روما میں مقیم تھے۔ مسولینی نے اپنے
سٹاف کے آدمی کے ذریعے انہیں کہلا بھیجا۔ کہ میں آپ سے
ملنا چاہتا ہوں۔ ڈاکٹر صاحب نے دعوت قبول کرلی۔ اور مسولینی
سے ملنے تشریف لے گئے۔ وہ ایک بڑے وسیع کمرے میں میز
کے قریب بیٹھا تھا۔ میز پر کاغذوں کا انبار تھا۔ ڈاکٹر صاحب
کمرے میں داخل ہوئے۔ تو وہ پیشوائی کے لئے بڑھا۔ اس کا
قد زیادہ اونچا نہیں تھا۔ لیکن بازو بھرے ہوئے تھے۔ سینہ کشادہ
اور آنکھیں شکرے کی آنکھوں کی طرح چمکیلی تھیں رسمی مزاج پرسی
کے بعد اس نے ڈاکٹر صاحب سے پوچھا۔ میری فاشسٹ تحریک
کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟ انہوں نے جواب دیا۔ آپ
نے "ڈسپلن" کے اس اصول کو ضرور اپنایا ہے جسے اسلام انسانی

نظامِ حیات کے لئے بہت ضروری سمجھتا ہے۔ لیکن اگر آپ
اسلام کے نظریۂ حیات کو پوری طرح اپنالیں۔ تو آپ کو دنیا و
عقبیٰ میں سرخروئی نصیب ہوگی لیکن یہ ایسی بات نہیں تھی۔ کہ
مسولینی کی سمجھ میں آسانی سے آجاتی۔ اس نے گفتگو کا رخ اس
طرف پلٹ دیا۔ کہ اٹلی اور اسلامی ملکوں کے تعلقات کس طرح
استوار ہوسکتے ہیں؟ اثنائے گفتگو میں ڈاکٹر صاحب نے فرمایا
کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے ہدایت کی تھی۔ کہ جب
مکہ معظمہ یا مدینہ منورہ کی آبادی حد سے تجاوز کر جائے۔ تو لوگ دوسرا
شہر آباد کرلیں۔ یہ حکم اس لئے دیا گیا تھا۔ کہ اگر کسی شہر کی آبادی
ایک مقررہ حد سے بڑھ جائے۔ تو اسکی تہذیبی قوت و اثر کے
عناصر کم ہوجاتے ہیں۔ اس لئے کیا اچھا ہو کہ ہر شہر کی آبادی

کی ایک خاص حد مقرر کر دی جائے۔ یہ سن کے مسولینی نے دونوں ہاتھ میز پہ مارے۔ اور چلّا کے کہنے لگا۔ واقعی یہ بہترین نظریہ ہے" ڈاکٹر صاحب مسولینی سے دیر تک گفتگو کرتے رہے۔ جب وہ اس سے رخصت ہوئے۔ تو لوگوں نے انہیں گھیر لیا۔ اور تقاضا کرنے لگے۔ کہ آپ ہمارے لیڈر کے متعلق اپنی رائے دیجئے۔ ڈاکٹر صاحب اس موضوع پر کچھ نہیں کہنا چاہتے تھے۔ لیکن لوگ راستہ روکے کھڑے تھے۔ اور ہجوم سے موٹر نکال کے لے جانا ناممکن معلوم ہوتا تھا۔ آخر مسولینی کے سٹاف کے آدمیوں نے کہا کہ ان لوگوں سے جان چھڑانا مشکل ہے۔ اس لئے کچھ نہ کچھ کہہ دیجئے۔ یہ سن کے ڈاکٹر صاحب نے ہجوم کو مخاطب کر کے فرمایا۔ "مسولینی بغیر بائبل کے لوتھر ہے"۔ یہ فقرہ اطالوی زبان میں ترجمہ ہوا۔

اور ہجوم میں بار بار دُھرایا گیا - لوگ سن کے خوشی سے ناچنے لگے
اور اسی وقت بڑے بڑے پوسٹر جن پر یہ فقرہ درج تھا چھاپ
کے در و دیوار پر چسپاں کر دیئے گئے -

مسولینی سے ڈاکٹر صاحب کی اس ملاقات اور ان
کی ایک نظم سے جو انہوں نے مسولینی کے متعلق لکھی ہے -
بعض لوگوں نے نتیجہ نکالا ہے - کہ خود ڈاکٹر صاحب کی طبیعت کا
رجحان بھی فاشزم کی جانب تھا - لیکن یہ بات صحیح نہیں -
مسولینی نے اپنے ملک کے لوگوں میں جو تنظیم پیدا کر دی تھی اسے
وہ پسند کرتے تھے - کیونکہ اسلام کی حقیقی رُوح بھی تنظیم ہے -
اور ان کی عادت تھی - کہ جب کسی تحریک میں انہیں کوئی ایسی
بات نظر آتی تھی جو اسلامی اصُولوں سے مشابہ معلوم ہوتی تھی - تو وہ

اسکی تعریف کرنے میں بخل سے کام نہیں لیتے تھے۔ ورنہ یہ سب کو معلوم ہے۔ کہ جب مسولینی نے حبشہ پر قبضہ کرلیا۔ تو انہیں سخت صدمہ ہوُا۔ چنانچہ انہوں نے اپنی مشہور نظم "پس چہ باید کرد اے اقوام شرق" لکھی۔ جس میں یورپ والوں کی ہوس ملک گیری کا ذکر نہایت تلخ انداز میں کیا گیا ہے۔

اپنے عہد کے جن بزرگوں سے ڈاکٹر صاحب کے بڑے گہرے مراسم تھے۔ ان میں اکبر الہ آبادی بھی تھے۔ وہ اکثر فرمایا کرتے تھے۔ کہ اکبر مرحوم سے میری بڑی دلچسپ خط و کتابت رہی ہے۔ اور میرے پاس وہ تمام خطوط بحفاظت موجود ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے انتقال کے بعد میں نے چودھری محمد حسین صاحب کو ان خطوط

کی اشاعت کی جانب متوجہ کیا۔ اور انہوں نے مجھے یقین دلایا
کہ انہیں خود ان خطوں کو چھاپنے کا خیال ہے۔ اکبر الہ آبادی مرحوم
نے ڈاکٹر صاحب کے نام جو خط لکھے ہیں۔ ان میں بھی ڈاکٹر صاحب
کا ذکر ایسے الفاظ میں کیا گیا ہے جن سے گہری وابستگی اور تعلق
خاطر کا پتہ چلتا ہے۔ اس سلسلہ میں ایک واقعہ یاد آگیا۔ ڈاکٹر صاحب
کو آم بہت مرغوب تھے۔ ایک مرتبہ اکبر نے الہ آباد سے ان کے
لئے لنگڑا آم کی ایک پیٹی بھجوائی۔ ڈاکٹر صاحب نے اسکی رسید
میں یہ شعر لکھ بھیجا۔ ؎

کرشمہ ہے یہ اعجازِ مسیحائی کا اے اکبر
الہ آباد سے لنگڑا چلا لاہور آ پہنچا،

ڈاکٹر صاحب فرمایا کرتے تھے۔ کہ جو دعا دل کی گہرائیوں سے نکلے ضرور قبول ہوتی ہے لیکن یہ ضروری نہیں۔ کہ دعا کا اثر فوراً ظاہر ہو۔ بعض دعائیں تو ایسی بھی ہوتی ہیں جن کا اثر کہیں موت کے بعد ظاہر ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ انسان کی زندگی بڑی مختصر ہے۔ اور نظام کائنات بہت وسیع ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے اس قول کی تصدیق ان کی زندگی کے واقعات سے ہوتی ہے۔ جو لوگ انکی زندگی کے حالات سے اچھی طرح باخبر ہیں انہیں معلوم ہے۔ کہ ڈاکٹر صاحب تیسری شادی کے بعد مدت تک اولاد سے محروم رہے۔ جب وہ قریب قریب اولاد کی طرف سے مایوس ہو چکے۔ تو حضرت مجدد الف ثانی کی درگاہ میں حاضر ہو کے دعا کی۔ کہ اللہ انہیں ایک بیٹا عطا کرے۔ جسے وہ اپنی زندگی میں

اعلےٰ تعلیم دے سکیں لیکن اس واقعہ کو بھی پانچ چھ برس گزر گئے
اور ان کی دعا قبول نہ ہوئی۔ ایک دن شام کو وہ گھر گئے۔
تو دیکھا۔ کہ جاوید کی والدہ طوطے کے بچے کو اپنے پاس بٹھا کے
بڑی شفقت سے پھل کھلا رہی ہیں۔ یہ کیفیت دیکھ کے
ڈاکٹر صاحب کی زبان سے بے اختیار یہ الفاظ نکل گئے۔ "الٰہی!
اس خاتون میں مادرانہ شفقت پیدا ہو چکی ہے۔ اب اسے اولاد
بھی عطا فرما"۔ یہ دعا قبول ہوئی۔ چنانچہ اسی سال جاوید سلمہٗ
تولّد ہوئے۔

ڈاکٹر صاحب کو جاوید میاں سے جس قدر محبت تھی۔
اسکا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں۔ جو ان کی خدمت میں روز حاضر
ہوتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب طبعاً بڑے خاموش اور سنجیدہ بزرگوار

تھے۔ لیکن جب کبھی وہ جاوید کو آواز دے کے بلاتے اسے کھیلتے ہوئے دیکھتے۔ یا احباب کے سامنے اسکا ذکر کرتے۔ تو پدرانہ شفقت ان کے دل کو گداز کر دیتی۔ اور ان کی آنکھیں نم آلود ہو جاتیں۔ کبھی کبھی رخساروں پر آنسو بہنے لگتے۔ پیشانی پہ زاویے ابھرتے اور مٹ جاتے۔ وہ جاوید سلمہٗ کو نصیحتیں کرتے۔ اپنے پاس بیٹھنے پر زور دیتے۔ لیکن کبھی کبھی میں نے یہ بھی دیکھا ہے۔ کہ جاوید کا ذکر کرتے کرتے۔ ان کا دل ڈوب سا جاتا۔ اور وہ یک بیک خاموش ہو جاتے۔

جن دنوں ڈاکٹر صاحب افغانستان کی سیاحت سے واپس آئے۔ تو میں والد محترم کے ہمراہ ان سے ملنے گیا۔ والد مرحوم نے اس موقع پر پیام مشرق کی اس نظم کا ذکر چھیڑ دیا۔ جس میں

شاہ افغانستان سے خطاب کیا گیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی تازہ کتاب "مسافر" کا ذکر کیا۔ جو انہوں نے افغانستان کے سفر کے زمانے میں لکھی تھی۔ اتنے میں جاوید میاں باہر سے کھیلتے کھیلتے کمرے میں آ گئے۔ والد مرحوم نے ان کا ہاتھ پکڑ کے بڑی شفقت سے پوچھا۔

"تمہارا باپ تو بادشاہوں کو سبق دیتا ہے۔ بڑے ہو کے تم کیا کرو گے؟"

یہ سن کے ڈاکٹر صاحب آبدیدہ ہو گئے۔ اور کہنے لگے

"نجم الدین۔ میرے دل کا بادشاہ تو یہی ہے۔"

ڈاکٹر صاحب کو اسلام سے بڑی شیفتگی تھی۔ سر

عبدالقادر مدظلہٗ کے قول کے مطابق اس کی وجہ یہ تھی۔ کہ ماں کے دودھ کے ساتھ اسلام ان کی رگ و پے میں نفوذ کر گیا تھا۔ انہوں نے اِسلام کی تعلیمات کا مطالعہ بڑے غور سے کیا تھا۔ اور اُسے خُوب سمجھا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ دنیا کے دُوسرے مذاہب کا بھی مطالعہ کر چکے تھے۔ اس لِئے نہ صرف اسلام بلکہ دوسرے مذاہب کے متعلق بھی وہ جو کچھ کہتے تھے۔ وہ بہت دقیع ہوتا تھا۔ ایک دفعہ ایک پادری ان سے ملنے آیا۔ اور اثنائے گفتگو میں پُوچھنے لگا۔ کہ حضرت مسیح علیہ السلام کے متعلق اسلام کیا کہتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا۔ اس سے پہلے کہ میں اس معاملہ میں اسلام کا نقطۂ نظر بیان کروں آپ بتائیے۔ کیا عیسویت کے نزدیک جناب مسیح اسی طرح خدا کے بیٹے تھے جس

طرح میں اپنے باپ کا بیٹا ہوں۔ یا آپ اپنے باپ کے بیٹے ہیں۔ یا محض استعارہ کے طور پر مسیحؑ کو خدا کا بیٹا کہا گیا ہے پادری نے جواب دیا۔ نہیں یہ تو صرف استعارہ ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا۔ "تو بس اسلام کا نظریہ بھی یہی ہے۔"

اس سلسلے میں ایک واقعہ یاد آگیا۔ ڈاکٹر صاحب کو لندن کے ایک اجتماع میں شریک ہونے کا موقع ملا۔ جہاں صرف اسلامیات کے متعلق تقریریں ہو رہی تھیں۔ اس اجتماع میں مختلف نسلوں کے تعلیم یافتہ لوگ موجود تھے۔ لوگوں کے اصرار پر حکیم الامت نے بھی ایک تقریر کی۔ جس میں انہوں نے اسلام کے اصولوں پر روشنی ڈالی تھی۔ جب وہ تقریر ختم کر چکے۔ تو ایک انگریز ان کے پاس آکے بیٹھ گیا۔ اور کہنے لگا۔ کہ آپ نے اپنی

تقریر میں جو کچھ کہا ہے" - اگر یہی اسلام ہے - تو ہم سب مسلمان ہیں - لیکن مشکل یہ ہے - کہ کسی کو برسرِ عام یہ بات کہنے کی ہمت نہیں ہوتی "

ڈاکٹر صاحب صحیح معنوں میں مردِ خود آگاہ تھے - یعنی اپنی صلاحیتوں اور خوبیوں سے زیادہ اپنی خامیوں پر نظر رکھتے تھے انہیں کبھی کبھی خیال آتا تھا - کہ اکثر لوگوں کو ان سے مل کے مایوسی ہوتی ہے - کیونکہ لوگ ان کا کلام پڑھ کے اپنے ذہن میں ان کے متعلق جو نقشہ قائم کر لیتے ہیں - اس پر وہ پورے نہیں اترتے چنانچہ ایک مرتبہ انہوں نے خواجہ حسن نظامی کو لکھا تھا - کہ "آپ لوگوں سے میرا ذکر کرتے رہتے ہیں - ان کے دل میں مجھ سے

ملنے کا اشتیاق پیدا ہوتا ہے۔ اس پر مجھے اعتراض تو نہیں۔ البتہ
یہ اندیشہ ضرور ہے۔ کہ انہیں مجھ سے مل کے کہیں مایوسی نہ ہو"
اس کی ایک وجہ یہ تھی۔ کہ بعض لوگ انہیں شاعر سمجھ کے ان
سے شاعروں کے سے تکلّف اور تصنّع کی توقّع رکھتے تھے بعض
حضرات ایسے بھی تھے۔ جو ان سے ملنے آتے تھے۔ اور چھوٹتے
ہی شعر سنانے کی فرمائش کر دیتے تھے۔ خاص طور پر بعض شعرا کا
جوان کی طبیعت سے ناواقف تھے یہی انداز تھا۔ وہ اس خیال سے
ان سے ملنے آتے تھے۔ کہ گھڑی دو گھڑی بیٹھیں گے۔ اپنا کلام
سنائیں گے۔ ڈاکٹر صاحب کا کلام سُنیں گے۔ لیکن ڈاکٹر صاحب
کی طبیعت کا انداز عام شاعروں سے مختلف تھا۔ انہیں خود نمائی
سے نفرت تھی۔ نہ مشاعروں میں جاتے تھے۔ نہ بزم کی صحبتوں میں

شعر سنتے اور سُناتے تھے۔ اس سلسلے میں ایک دلچسپ واقعہ
یاد آگیا۔ جو میں نے خود ان کی زبانی سُنا تھا۔ مرحوم نواب ذوالفقار علی خان
کے ساتھ ڈاکٹر صاحب کے بڑے گہرے تعلقات تھے۔ ایک
دفعہ ڈاکٹر صاحب ان کی دعوت پر ڈیرہ دُون تشریف لے گئے۔
وہاں اتفاق سے ان دنوں نواب صاحب رام پور بھی آئے
ہُوئے تھے۔ ایک دفعہ انہوں نے نواب ذوالفقار علی خان کو
کھانے پر بلایا۔ اور ساتھ یہ بھی کہلا بھیجا۔ کہ سُنا ہے آپ کے
دوست ڈاکٹر اقبال بھی ان دِنوں یہیں ہیں۔ انہیں اپنے ساتھ
ضرور لے آیئے۔ مجھے ان سے مِلنے کا بڑا اشتیاق ہے۔ نواب
ذوالفقار علی نے ڈاکٹر صاحب سے ذکر کیا۔ تو اُنہوں نے
صاف انکار کر دیا۔ لیکن جب ذوالفقار علی نے اصرار کیا۔ تو

کہنے لگے۔ کہ میں ایک شرط پر چلنے کے لئے تیار ہوں۔ کہ نواب
صاحب رام پور جو شاعروں کے بڑے قدردان سمجھے جاتے ہیں
بلکہ خود بھی شعر کہتے ہیں نہ تو مجھ سے شعر سُنانے کی فرمائش
کریں۔ نہ خود اپنے اشعار سُنائیں۔ نواب ذوالفقار علی خان
نے یہ شرط بادلِ نخواستہ منظور کرلی۔ نواب صاحب رام پور کو
بھی اس بات کی اطّلاع کر دی گئی۔ چنانچہ انہوں نے اپنا کلام
سنایا۔ نہ ڈاکٹر صاحب سے شعر سنانے کی فرمائش کی۔

غیروں کو تو جانے دیجئے۔ ڈاکٹر صاحب اپنے خاص
خاص نیاز مندوں کو بھی کبھی کبھار ہی اپنا تازہ کلام سناتے تھے۔
مجھے سالہا سال ان کی خدمت میں حاضر ہونے کا اتّفاق ہوتا
رہا ہے لیکن صرف ایک مرتبہ ان کی زبان سے ان کا ایک شعر

سُنا۔ یہ شعر "بالِ جبریل" میں موجود ہے۔ لیکن اس زمانے میں "بالِ جبریل" ابھی شائع نہیں ہوئی تھی۔ البتہ اسکا مسوّدہ ضرور زیرِ ترتیب تھا۔ وہ شعر یہ ہے ؎

یہ مصرع لکھ دیا کس شوخ نے محرابِ مسجد پر
یہ ناداں گر گئے سجدے میں جب وقتِ قیام آیا

ڈاکٹر صاحب کو اپنے استاد مولوی سیّد میر حسن مرحوم سے جو محبّت اور عقیدت تھی۔ اسکا ذکر ان کے خطاب کے تذکرہ میں آچکا ہے۔ میں نے اکثر دیکھا ہے۔ کہ ڈاکٹر صاحب جب مولوی صاحب مرحوم کا ذکر کرتے تھے۔ ان کی آنکھیں پرنم ہو جاتی تھیں۔ اکثر کہا کرتے تھے کہ اُسوۂ رسُولؐ پر صحیح معنوں میں

اگر کسی شخص کا عمل ہے تو وُہ مولوی سید میر حسن سیالکوٹی ہیں۔
وہ اکثر مولوی صاحب کے ہاں کی پر لطف صُحبتوں کا ذکر کرتے
تھے۔ اور کہتے تھے۔ کہ ان کے ہاں ہمیشہ اہل علم کی محفل جمی رہتی
تھی۔ اور گھنٹوں مختلف مسائل پر بڑی دلچسپ بحثیں ہوتی تھیں
اس سلسلے میں اُنہوں نے مولوی صاحب کی زندگی کے کئی
دلچسپ واقعات بھی سُنائے۔ ایک روز کہنے لگے۔ کہ ایک
مرتبہ مرے کالج کے کسی انگریز پروفیسر نے ان سے کہا مولوی صاحب
آپ کا خُدا بہت سُست معلوم ہوتا ہے۔ کہ آپ پانچ دفعہ اذان
دے کے اُسے جگاتے ہیں۔ مولوی صاحب نے جواب دیا۔ اور
آپ کا خُدا ہمارے خُدا سے ۳۵ گُنا زیادہ سُست ہے۔ کیونکہ ہفتہ
بھر گھنٹے بجا بجا کے اُسے جگاتے رہتے ہیں۔ اور وہ پھر بھی

نہیں جاگتا۔"

مولوی صاحب کی وضع داری کا ذکر کرتے ہوئے کہا

ایک دفعہ انہیں ایم اے او کالج علی گڑھ کی پروفیسری پیش کی گئی۔

انہوں نے جواب میں لکھا۔ مرے کالج سیالکوٹ کی آمدنی

سے میری تین پشتوں یعنی میرے والدین۔ میری اولاد اور خود

میں نے پرورش پائی ہے۔ اسلئے میں اس کالج کو چھوڑ نہیں

سکتا۔

ڈاکٹر صاحب اپنے اُستاد کا جس قدر احترام کرتے تھے

اسکا اندازہ اس بات سے ہوسکتا ہے۔ کہ انہیں مولوی صاحب کو

اپنا کلام سُنانے کی جُرأت بھی نہیں ہوتی تھی۔ ایک دفعہ کہنے

لگے۔ زندگی بھر میں ان کے سامنے صرف ایک مرتبہ میری زبان

سے ایک مصرع نکل گیا۔ وہ بھی اتفاقی طور پر مولوی صاحب کسی کام کے لیئے گھر سے نکلے ایک بچہ جوان کے عزیزوں میں تھا اور جس کا نام "احسان" تھا۔ ان کے ساتھ تھا۔ مولوی صاحب کہنے لگے اقبال اسے گود میں اٹھا لو۔ میں نے اُسے گود میں اٹھا لیا کچھ دُور جا کے میں تھک گیا۔ چنانچہ میں نے بچے کو تو ایک دکان کے تختوں پر کھڑا کر دیا۔ اور خود سُستانے لگا۔ مولوی صاحب اتنے میں بہت آگے نکل گئے تھے۔ ہمیں اپنے ساتھ نہ پایا۔ تو اُلٹے پاؤں لوٹے۔ اور میرے قریب آ کے فرمایا ——

اقبال! "اِس کی برداشت بھی دشواری ہے"

میری زبان سے بے اختیار نکل گیا۔

"تیرا احسان بہت بھاری ہے"

مولوی میر حسن صاحب مرحوم کے متعلق ڈاکٹر صاحب
نے ایک دفعہ یہ بھی بتایا۔ کہ انہیں اپنی چھوٹی بہن سے بے حد
محبت تھی۔ اتفاق سے ایک مرتبہ وہ ایسی بیمار ہوئی۔ کہ جانبر ہونے
کی توقع نہ رہی۔ مولوی صاحب ہر دم کمسن بچی کے پاس بیٹھے
ہوئے اُسے ڈھارس بندھاتے رہتے۔ فوت ہونے سے چند
گھنٹے قبل بچی نے حسرت سے کہا۔ "اب تو آپ ہر وقت میرے
پاس رہتے ہیں۔ لیکن مرنے کے بعد میں آپ سے کیسے ملوں
گی؟" مولوی صاحب نے فوراً ہی آبدیدہ ہو کر وعدہ کیا۔ کہ "پریشان
نہ ہو۔ میں تم سے روزانہ ملا کروں گا۔" بچی نے داعی اجل کو لبیک
کہا۔ اور مولوی صاحب نے اسی دن سے معمول بنا لیا۔ کہ صبح ہی
گھر سے قبرستان کو چل دیتے۔ اور بہن کی قبر پر پہنچے تک قرآنِ کریم

کی ایک منزل ختم کر لیتے واپسی میں بھی اسی طرح تلاوت فرماتے۔
ڈاکٹر صاحب فرمایا کرتے تھے۔ کہ مولوی صاحب تمام زندگی اس
قاعدہ پر عمل پیرا رہے۔ اور عالمِ ضعیفی میں بھی بدستور ان کا یہی
معمول رہا۔ حتیٰ کہ بعض اوقات وہ اس معمول کو باقی رکھنے کیلئے ضروری
کاموں اور سفر کو بھی ملتوی کر دیتے تھے۔

ڈاکٹر صاحب مجھ پر بہت شفقت فرماتے تھے۔ لیکن یہ
عجیب بات ہے۔ کہ ان سے میری خط و کتابت بہت کم ہوئی
ہے۔ حالانکہ ان کی عادت تھی کہ خط نہایت باقاعدگی سے لکھتے
تھے۔ اور باقاعدگی سے خطوں کا جواب دیتے تھے۔ اس کی وجہ یہ
ہے۔ کہ مجھے کبھی ان کے نام خط لکھنے کی ضرورت ہی پیش نہیں

آئی - انہوں نے لاہور سے بہت کم قدم باہر نکالا - میری زندگی کا زیادہ حصّہ بھی لاہور ہی میں گزرا - اسلئے خط وکتابت کی نوبت ہی نہ آئی - آج پرانے کاغذات کو الٹ پلٹ کے دیکھ رہا تھا - تو ان کا ایک خط نظر آیا - اصل واقعہ یُوں ہے - کہ میں ایک ضروری کام کے سلسلے میں بمبئی جا رہا تھا - ڈاکٹر صاحب کو معلوم ہوُا - تو مجھے بلا کے کہا کہ رفیق غزنوی نے میری چند غزلیں ہز ماسٹرز وائس پر ریکارڈ کرائی ہیں - ان سے مل کے ذرا یہ معلوم کرنا - کہ وہ کونسی غزلیں ہیں - میں نے بمبئی پہنچ کے اس سلسلے میں معلومات حاصل کیں - اور ڈاکٹر صاحب کو خط لکھا - غالباً میں نے جو معلومات بہم پہنچائی تھیں - وہ نامکمل تھیں اسلئے انہوں نے مجُھے ذیل کا خط لکھا -

ڈیر وحید۔

"آپ کا خط مل گیا ہے۔ معلوم یہ کرنا ہے۔ کہ وہ غزل یا غزلیں کونسی تھیں۔ جو رفیق صاحب نے گائیں۔ ان کا ایک ایک مصرع ان سے لکھوا لیجئے ان کے خط میں غزل کا نشان درج نہیں ہے۔"

محمد اقبال
۲۷ جولائی ۳۴ء

ڈیر وحید - آپ کا خط ملا [illegible]

معلوم ہوتا ہے کہ وہ غزل یا غزلیں [illegible] جو

[illegible] صاحب نے مانگی ہیں ان میں ایک مصرع ان سے بگڑا ہوا - [illegible]

میں غزل ان کو بھیجتا ہوں - [illegible] محمد اقبال

۲۷ جولائی ۳۲ء

ڈاکٹر صاحب مجھ پر جسقدر شفقت فرماتے تھے۔ اس سے زیادہ میری والدہ محترمہ کا خیال رکھتے تھے۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ تھی۔ کہ وہ ان کے مہربان دوست فقیر سیّد افتخار الدین مرحوم کی صاحبزادی تھیں۔ اس پرانے اور مخلصانہ رشتۂ مودت نے ہمیں ایک دوسرے کے اتنا قریب کر دیا تھا۔ کہ جب میرے حقیقی بھائی فقیر سید صبیح الدین کی شادی کا مسئلہ پیش ہوا۔ تو والد ماجد نے ڈاکٹر صاحب سے مشورہ کیا۔ انہوں نے خواجہ حسن نظامی کو خط لکھا اور خواجہ صاحب نے دہلی کے قریب فرید آباد میں اپنے ایک دوست کے ہاں ان کا رشتہ کرا دیا۔

۱۹۳۷ء میں جب والد محترم کا انتقال ہوا۔ تو ڈاکٹر صاحب کو خبر سن کے سخت صدمہ ہوا۔ لیکن وہ اس زمانے میں خود بیمار

تھے ۔اس لئے نمازِ جنازہ میں شریک ہونے کے لئے نہ پہنچ سکے۔ البتہ اس واقعہ سے کئی دنوں کے بعد شام کے وقت علی بخش کے ساتھ ہمارے ہاں تشریف لائے۔ اس وقت میں گھر پہ موجود تھا۔ ڈاکٹر صاحب بہت مضمحل اور ناتواں سے معلوم ہو رہے تھے۔ گلے کی تکلیف بہت بڑھ گئی تھی۔ آواز بیٹھی ہوئی تھی۔ اور مشکل سے سُنائی دیتی تھی۔ وُہ زیادہ دیر باتیں بھی نہیں کر سکتے تھے۔ ایک جُملہ کہتے اور پھر رُک جاتے۔ اس زمانے میں ان کی بینائی بھی قریب قریب جاتی رہی تھی۔ ہمارے ہاں وہ دیر تک بیٹھے رہے۔ لیکن تعزیت کے چند جُملے کہنے کے بعد انہیں چُپ سی لگ گئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ وُہ افق کے پار۔ زرنگار بادلوں کی سرحد سے پرے اپنی منزل کا نشان تلاش کر رہے ہیں۔ جاوید سلمہٗ

کی والدہ کے انتقال کے بعد ان کی صحت برابر گرتی چلی گئی تھی۔
اس حالت میں اپنے عزیز دوست کی موت کا حادثہ ان کے لئے
بڑا صدمۂ جانکاہ تھا۔ وہ دیر تک یونہی چپ چاپ بیٹھے رہے۔
لیکن اُن کے چہرہ سے ذہنی کرب کے آثار صاف نظر آرہے
تھے۔

حرفے زلبش شنیدہ ام من

حکیم الامت علامہ اقبال پر اگرچہ استغراق و محویت کی ایسی کیفیت بھی طاری ہوتی تھی۔ کہ وہ پہروں چپ چاپ بیٹھے رہتے تھے۔ لیکن احباب کی صحبت میں جب سکوت کا یہ بند ٹوٹ جاتا تھا۔ تو ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ خیالات کا سمندر اُمڈا چلا آرہا ہے۔ ایسے موقعوں پر کبھی موضوع کو لے کے وہ گھنٹوں مسلسل اس پر گفتگو کرتے چلے جاتے تھے۔ ایک ہی موضوع کے موافق اور مخالف دلائل دیتے۔ ان کا تجزیہ کرتے اور ایسے ایسے حکیمانہ نکتے پیدا کرتے۔ کہ لوگ حیران رہ جاتے

تھے لیکن ان کی گفتگو خشک اور بے کیف نہیں ہوتی تھی
قُدرت نے انہیں خُداداد ذہانت علم و فضل کے ساتھ ساتھ
بذلہ سنجی اور ظرافت کی نعمت بھی عطا فرمائی تھی - اس لئے وہ
خشک سے خشک بحث کو لطیفوں چُست فقروں اور پھبتیوں
سے پُر لُطف بنا دیتے تھے مجھے یقین ہے - کہ اگر کسی طرح
ان کی گفتگو محفوظ کر لی جاتی تو ہر صحبت کی رُوداد ایک اچھی
خاصی کتاب کی صُورت اختیار کر لیتی - کبھی کبھی وُہ باتیں کرتے
کرتے جوش میں آ کے کہہ جاتے تھے کہ میں اس موضوع پر پُوری
کتاب لکھ سکتا ہُوں لیکن حقیقت یہ ہے - کہ اس وقت تک
- زیر بحث موضوع کے متعلق انہوں نے جو کچھ کہا تھا - وہ خاصی
بڑی کتاب کا مضمون تھا - میں اکثر سوچتا ہُوں - کہ اگر کوئی شخص

ان محفلوں کی پُوری رُوداد قلم بند کرتا جاتا۔ تو آج ڈاکٹر صاحب کے ملفوظات کی سینکڑوں جلدیں ہمارے پاس موجود ہوتیں مجھے خود اس بات کی توفیق نہیں ہُوئی۔ کہ کبھی کاغذ پنسل لے کے ان کے پاس بیٹھ جاتا۔ اور وہ جو کچھ فرماتے اُسے قلمبند کر لیتا۔ اس لئے ذہن میں جو واقعات محفوظ رہ گئے ہیں۔ انہیں نقل کئے دیتا ہُوں۔

ایک عقیدتمند

میرے ایک دوست شریف احمد ریلوے میں ملازم تھے۔ انہیں حکیم الامّت سے اس قدر عقیدت تھی۔ کہ انہوں نے مرحُوم کے کلام کا بیشتر حصّہ حفظ کر لیا تھا۔ اور ہمیشہ اُس کا

ورد کرتے رہتے تھے۔ ایک دن میں نے ان سے دریافت کیا۔ تم ڈاکٹر صاحب کے کلام پر اتنے فریفتہ ہو لیکن کبھی اُن سے ملے بھی ہو۔ انہوں نے جواب دیا۔ مجھے ان کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقع تو نہیں ملا۔ البتہ اشتیاق ضرور ہے میں شریف احمد کو ڈاکٹر صاحب کے پاس لے گیا۔ اور ان کا تعارف کراتے ہوئے ڈاکٹر صاحب سے کہا۔ "قبلہ جس طرح میکالے نے کہا ہے۔ کہ اگر ملٹن کی نظم "پیراڈائز لاسٹ" Faradise Last کے تمام نسخے نیست و نابود ہو جائیں۔ تو میں حافظہ کی مدد سے اسے لکھوا سکتا ہوں۔ اسی طرح میرا یہ دوست آپ کے کلام کا حافظ اور اس لحاظ سے دوسرا میکالے ہے۔ یہ سن کے ان کے چہرے پر جو علالت کی وجہ سے مضمحل

ہو رہا تھا۔ مسرت کی لہر دوڑ گئی اور آنکھوں میں ایک تیز سی چمک پیدا ہو گئی۔ اس واقعہ سے چند ہفتوں کے بعد ڈاکٹر صاحب کا انتقال ہو گیا۔ شریف احمد کو اب تک اس بات پر بڑا فخر ہے۔ کہ اسے ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں حاضر ہونے اور ان سے گفتگو کرنے کی سعادت حاصل ہو چکی ہے۔

وطن کی بہنیں

اخبار وطن کے ایڈیٹر مولوی انشاء اللہ خان ڈاکٹر صاحب کے ہاں اکثر آیا جایا کرتے تھے۔ ان دنوں ڈاکٹر صاحب انارکلی میں رہتے تھے۔ انارکلی میں کشمیری طوائفیں بھی رہتی تھیں میونسپلٹی نے ان کے لیئے دوسری جگہ تجویز کی۔ چنانچہ انہیں وہاں سے اٹھوا

دیا گیا۔ اس زمانے میں مولوی انشاءاللہ خان کئی مرتبہ ڈاکٹر صاحب سے ملنے گئے لیکن ہر مرتبہ یہی معلوم ہوُا۔ کہ ڈاکٹر صاحب باہر گئے ہوئے ہیں۔ اتفاق سے ایک دِن جو گئے۔ تو ڈاکٹر صاحب گھر پر موجود تھے۔ مولوی صاحب نے کہا ڈاکٹر صاحب جب سے طوائفیں انارکلی سے اٹھوادی گئی ہیں۔ آپ کا دل بھی یہاں نہیں لگتا۔ ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا۔ مولوی صاحب آخر وہ بھی "تو وطن کی بہنیں" ہیں۔

تہذیب کا پیمانہ

ایک دفعہ تہذیب و تمدّن کے متعلّق باتیں ہو رہی تھیں۔ ایک شخص نے کہا۔ تہذیب بتدریج بڑی نمایاں ترقی

کر رہی ہے - ڈاکٹر صاحب نے کہا - ذرا مجھے بھی تو بتائیے -
کہ آپ نے تہذیب کو کس پیمانے سے ناپ کے یہ معلوم کیا
ہے کہ وہ برابر ترقی کرتی جا رہی ہے - اگر آپ کے پاس تہذیب
کو ناپنے کا کوئی پیمانہ نہیں - تو آپ کو ماننا پڑیگا - کہ دَور حاضر
میں تہذیب رُو بہ تنزّل ہے

"بس کی بات نہیں"

علی بخش ڈاکٹر صاحب کا پرانا ملازم ہے - وہ ۱۸۹۸ء
میں ان کے ہاں نوکر ہُوا - اسکی شادی بچپن ہی میں ہوگئی - بیوی
تھوڑے عرصہ کے بعد انتقال کر گئی - چنانچہ اس نے دُوسری
شادی نہ کی - اور اپنی ساری عُمر ڈاکٹر صاحب کی خِدمت

کے لِئے وقف کر دی۔ میں اکثر اس کی وفاداری کا ذکر ڈاکٹر صاحب سے کیا کرتا تھا۔ ایک دِن میں نے کہا قبلہ۔ علی بخش سالہا سال سے آپ کی خدمت کر رہا ہے۔ کبھی اس کے متعلق بھی ایک آدھ شعر ہو جائے۔ ڈاکٹر صاحب کہنے لگے۔ "یہ میرے بس کی بات نہیں۔ شعر آ گیا۔ تو لکھوا دوں گا۔"

شاعر کی آنکھیں

ایک دفعہ میں نے زمانہ کی قدر ناشناسی کا ذکر کیا اور کہا کہ لوگ اپنے ملک کے بڑے بڑے شاعروں۔ قومی رہنماؤں اور عظیم المرتبت انسانوں کی زندگی میں ان کی قدر نہیں کرتے۔ ڈاکٹر صاحب اس سوال سے بہت متاثر ہوئے۔ اور کسی قدر تامّل

کے بعد فرمایا - تم غور کرو تو معلوم ہوگا - کہ جب شاعر کی آنکھیں کھلی ہوتی ہیں - تو دُنیا کی بند ہوتی ہیں - اور جب شاعر کی آنکھیں ہمیشہ کے لِئے بند ہو جاتی ہیں - تو دُنیا کی آنکھیں کھُل جاتی ہیں - اور وہ صدیوں تک اسکی تعریف و توصیف کے گیت گاتی رہتی ہے

عورت کی ذمہ داری

ایک مرتبہ کہنے لگے - کہ جس قوم نے عورتوں کو ضرورت سے زیادہ آزادی دی - وہ کبھی نہ کبھی ضرور اپنی غلطی پر پشیمان ہوئی ہے - عورت پر قدرت نے اتنی اہم ذمہ داریاں عاید کر رکھی ہیں - کہ اگر وہ ان سے پُوری طرح عہدہ برآ ہونے کی کوشش کرے - تو اُسے کسی دُوسرے کام کی فرصت ہی

نہیں مل سکتی - اگر اسے اس کے اصلی فرائض سے ہٹا کے
ایسے کاموں پر لگایا جائے جنہیں مرد انجام دے سکتا ہے۔
تو یہ طریق کار یقیناً غلط ہوگا۔ مثلاً عورت کو جسکا اصل کام آئندہ
نسل کی تربیت ہے "ٹائپسٹ یا کلرک" بنا دینا نہ صرف قانونِ
فطرت کی خلاف ورزی ہے - بلکہ انسانی معاشرہ کو درہم و برہم
کرنے کی افسوسناک کوشش ہے۔

بغاوت

میں نے ایک مرتبہ ڈاکٹر صاحب سے پوچھا - کیا یہ
صحیح ہے - کہ انسان بغاوت کا دوسرا نام ہے - ڈاکٹر صاحب
نے فرمایا - بالکل صحیح! - آخر تمہیں کہو - تم نے اپنے والدین

کے احکام کی تعمیل کہاں تک کی ہے۔ کیا تُم میں سرکشی کی رُوح نہیں تم اپنے آپ کو بار بار بغاوت پر آمادہ نہیں پاتے؟ میں نے شرمندہ ہو کے نگاہیں جُھکا لیں۔

شاعر کا شکریہ!

ڈاکٹر صاحب گلے کی تکلیف میں مبتلا ہُوئے۔ تو حکیم عبدالوہاب عُرف حکیم نابینا سے رجُوع کیا حکیم صاحب نے بڑی توجّہ سے علاج کیا۔ لیکن خاطر خواہ فائدہ نہ ہُوا۔ ایک مرتبہ حکیم صاحب کے علاج کا ذکر کرتے ہُوئے فرمایا۔ کہ حکیم نابینا صاحب جن دنوں میرا علاج کر رہے تھے میں نے ان سے کہا۔ کہ اگر میں اچھّا ہو گیا۔ تو شکر گزاری کے طور

پر ایسے اشعار لکھوں گا۔ جن کی نظیر شاعری میں مشکل ہی سے
مِل سکے گی۔

لیکن حکیم صاحب کا علاج بھی بے سُود ثابت ہُوا۔ اور یہ اشعار
لکھنے کی نوبت ہی نہ آئی۔

محرومی

گلے کی تکلیف شروع ہوتے ہی ڈاکٹر صاحب کی آواز
بیٹھ گئی تھی۔ اس حادثہ نے ان کی رہی سہی مصروفیتیں بھی ختم
کر دیں۔ اور انہوں نے باہر نکلنا ہی چھوڑ دیا۔ اس زمانے میں
انہیں ترکی اور مصر سے تقریر کرنے کی دعوتیں آئیں۔ ان
دعوت ناموں کا ذکر آتا تھا۔ تو کہتے تھے۔ کہ میرا گلا ٹھیک ہوتے

تو ضرور جاؤں گا۔ لیکن مرض بڑھتا گیا۔ اور ڈاکٹر صاحب صحّت کی جانب سے مایُوس ہو گئے۔ ایک دن بڑے مایُوسی کے لہجہ میں فرمایا۔ خدا نے مجھے زبان تو عطا کی ہے۔ لیکن آواز سے محروم کر دیا۔ یہ کہتے کہتے ان پر رقّت طاری ہو گئی۔

شکوۂ ہند

ایک مرتبہ میں نے مسدّس حالی کا ذکر کرتے ہوئے کہا۔ آپ کے شکوہ سے پہلے مولینا حالی نے بھی تو شکوہ لکھا ہے۔ کہنے لگے ہاں مسدس حالی کو بھی شکوہ ہی کہنا چاہیئے۔ لیکن وہ صرف "شکوۂ ہند" تھا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دیدار

ایک بزرگ نے ڈاکٹر صاحب سے کہا۔ مجھے آنحضرتؐ کے دیدار کا بڑا شوق ہے لیکن یہ آرزو پوری نہیں ہوتی۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا۔ اگر آپ کو واقعی آنحضرتؐ کے دیدار کا شوق ہے۔ تو اُسوۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر چلئے۔ اور وہ اوصاف پیدا کیجئے۔ جو صحابہ نے سُنّتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر عمل کر کے اپنے اندر پیدا کر لئے تھے۔ آپ کی آرزو خود بخود پوری ہو جائے گی۔

مطالعہ

ایم۔ این لڈوگ نے نپولین بوناپارٹ کے متعلق

ایک بہت اچھّی کتاب لکھّی ہے۔ میں نے کِتاب پڑھی۔ تو
اس میں یہ واقعہ پڑھکے بڑی حیرت ہوئی۔ کہ نپولین کا نوکر
رستم بن رضا اس کے مطالعہ کے لِئے روز صبح کو بہت سی
کِتابیں جیل میں لے آتا تھا۔ اور شام کو وہ سب واپس لے جاتا تھا
ڈاکٹر صاحب سے اس واقعہ کا ذکر آیا۔ تو میں نے کہا "حیرت
ہے۔ کہ نپولین دن بھر میں اتنی کتابیں کیسے پڑھ لیتا تھا۔ ڈاکٹر
صاحب نے جواب دیا۔ اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں
میں خود تھوڑے سے وقت میں بہت سی کتابیں پڑھ ڈالتا
ہُوں۔ اصل بات یہ ہے۔ کہ جب انسان کا مطالعہ بہت
وسیع ہو جاتا ہے۔ تو وہ بہت سی باتوں کو جو بار بار دُہرائی جاتی
ہیں۔ اور جنہیں بار بار پڑھنا غیر ضروری ہے نظر انداز کرتا چلا

جاتا ہے ۔ اور صرف وُہی حِصّے پڑھتا ہے جن میں کوئی نئی بات بیان کی گئی ہو ۔ پھر کہنے لگے ۔ ایسی کتاب تو کہیں صدیوں میں لکھی جاتی ہے ۔ جو شروع سے آخیر تک اسطرح بالاستیعاب پڑھنے کے لائق ہو ۔ کہ اس کا ایک لفظ بھی چھوٹنے نہ پائے ۔

عتابؐ

زندگی بھر میں ڈاکٹر صاحب مجھ سے صرف ایک مرتبہ ناراض ہوئے ۔ آپ کو معلوم ہے ۔ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اُن کی عقیدت عشق کی حد تک پہنچی ہوئی تھی ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نام زبان پر آتا تھا ۔ تو اُن کی آنکھیں پُرنم ہو جاتی تھیں ۔ ایک روز میں نے جُرأت کر کے

پُوچھا۔ "آپ نے کبھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کی زیارت بھی کی ہے؟" یہ سنتے ہی مارے غصّہ کے ان کا چہرہ سُرخ ہوگیا۔ اور ابرو پر بل پڑ گئے۔ پھر کہنے لگے۔ "ایسے سوال نہیں کیا کرتے۔"

"سامانِ دوئی ہم سوختم"

میرے خاندان کے لوگوں میں سے ڈاکٹر صاحب کے تعلقات سب سے پہلے میرے نانا فقیر سیّد افتخار الدّین مرحُوم کے ساتھ استوار ہوئے۔ وُہ اپنے ہم عصروں میں بڑی ممتاز حیثیت رکھتے تھے۔ انہوں نے اپنی زندگی میں بعض ایسے جلسوں کی صدارت بھی کی تھی۔ جن میں ڈاکٹر صاحب نے

اپنی بعض مشہور نظمیں پڑھی تھیں فقیر سیّد افتخار الدّین اور مرزا سلطان احمد میں بڑی گہری دوستی تھی۔ ڈاکٹر صاحب کی بھی ان دونوں سے بے تکلفی تھی۔ خان بہادر شیخ فیض محمّد صاحب (سپیکر پنجاب اسمبلی) نے ان تینوں حضرات کی دوستی اور رفاقت کے متعلق ایک دلچسپ واقعہ سُنایا۔ ایک مرتبہ انجمن حمایت اسلام کے سالانہ اجلاس کی دو نشستوں میں ایک کی صدارت فقیر سید افتخار الدّین نے کی۔ اور دُوسری کی مرزا سلطان احمد نے پہلی نشست مغرب کی نماز سے پہلے ختم ہوگئی۔ اور دُوسری مغرب کی نماز کے بعد شروع ہُوئی پہلی نشست میں ڈاکٹر صاحب نے اپنی مشہور نظم "شمع و شاعر" پڑھی تھی۔ جو ان کی اُردو نظموں میں خاص درجہ اور مقام رکھتی ہے

یہ نشست ختم ہونے کے بعد سب لوگ جلسہ گاہ سے نکلے۔ تو مرزا سلطان احمد نے ڈاکٹر صاحب سے کہا۔ "تم بھی عجب ہرجائی ہو۔ کبھی میری بغل میں اور کبھی فقیر افتخار الدین کی بغل میں۔" ڈاکٹر صاحب نے اس فقرہ کے جواب میں ذیل کے اشعار فی البدیہہ ارشاد فرمائے۔

ہم نشینِ بے ریائم از رہ اخلاص گفت
اے کلامِ تو فروغِ دیدہ برنا و پیر
درمیانِ انجمن معشوق ہرجائی مباش
گاہ با سلطان باشی گاہ باشی با فقیر
گفتمش اے ہمنشیں معذور می دارم ترا
در طلسمِ امتیازِ ظاہری ہستی اسیر

من کہ شمعِ عشق را در بزمِ جاں افروختم
سوختم خود را و سامانِ دُوئی ہم سوختم

یہ اشعار اس سے پہلے کہیں شائع نہیں ہوئے

یہ تو آدمی ہیں

میرے ایک قریبی رشتہ دار سیّد واجد علی کو کتّے پالنے کا بڑا شوق تھا۔ ایک دفعہ میں ان کے ساتھ موٹر میں بیٹھ کے ڈاکٹر صاحب سے ملنے گیا۔ موٹر میں ان کے کُتّے بھی تھے ہم لوگ ڈاکٹر صاحب کے پاس جا بیٹھے۔ اور کتّوں کو موٹر ہی میں چھوڑ دیا۔ تھوڑی دیر میں ڈاکٹر صاحب کی ننھی بچّی مُنیرہ بھاگتی ہوئی آئی۔ اور کہنے لگی۔ "ابّا جان موٹر میں کتّے آئے ہیں"

ڈاکٹر صاحب نے ہماری طرف اشارہ کرکے کہا۔" نہیں بیٹا یہ تو آدمی ہیں"۔

خوش فہمی

لوگوں میں مشہور ہے۔ کہ جو شخص حج کرلے۔ اس کے سارے گناہ معاف ہوجاتے ہیں۔ میں نے ڈاکٹر صاحب سے ایک مرتبہ پوچھا" کیا یہ صحیح ہے۔ کہ حج کرنے سے گناہ معاف ہوجاتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا۔

"نہیں یہ تو بالکل غلط ہے"

میں نے عرض کیا۔ تو" حج کی غرض وغایت کیا ہے"۔

جواب ملا۔" بس خدا کا حکم ہے"۔

بعد میں جب حج کی ضرورت و اہمیت میرے ذہن نشین ہوئی تو مجھے سخت تاسّف ہُوا۔ کہ میں نے ڈاکٹر صاحب سے اس قسم کا سوال ہی کیوں کیا تھا۔

اندیشۂ مرگ

گلے کی تکلیف میں ایک ڈاکٹر۔ علاّمہ اقبال کو دیکھنے آیا۔ اس نے چند دوائیں تجویز کیں۔ پھر کہنے لگا۔ اس مرض میں پرہیز ضروری ہے۔ فلاں فلاں چیزوں سے پرہیز کیجئے۔ علاّمہ نے پُوچھا۔ لیکن اگر میں آپ کی ہدایات پر عمل نہ کروں تو۔" ڈاکٹر نے جواب دیا۔ تو خدانخواستہ آپ کی جان خطرے میں پڑ جائے گی۔ حکیم الامّت کہنے لگے۔ ڈاکٹر صاحب کیا انسان

کی زندگی کا کوئی لمحہ ایسا ہے۔ جو موت کے خطرے سے خالی ہے۔

ڈاکٹر یہ سن کے حیران رہ گیا۔ اور پھر کہنے لگا۔ آپ کی سی طبیعت کا مریض میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔

لارڈ کچنر

لارڈ کچنر جو ایک زمانے میں ہند کا کمانڈر انچیف بھی رہ چکا تھا۔ بڑے مشہور برطانوی جرنیلوں میں سے تھا۔ پہلی عالمگیر جنگ کے زمانے میں وہ غرقاب ہوا۔ تو جس طرح آج ہٹلر کے متعلق کہا جا رہا ہے۔ کہ وہ زندہ ہے۔ اور دنیا کے سامنے آنے کے لیئے مناسب موقع کا منتظر ہے۔ اسی

طرح کچنر کے متعلق بھی یہ افسانہ تراش لیا گیا۔ کہ وہ ڈوبا نہیں بلکہ زندہ ہے۔ علامہ اقبال ایک روز والد بزرگوار سے باتیں کر رہے تھے۔ اتنے میں ایک خوش فکر بزرگوار نے کہا۔ "سنا ہے کچنر زندہ ہو گیا ہے۔"

علامہ مرحوم نے جواب دیا۔ "ہاں ممکن ہے۔ کاڈلیور آئل" کی صورت میں آگیا ہو۔

ایک جلسہ

پہلی جنگِ عظیم کے ختم ہونے سے کچھ عرصہ پہلے سر مائیکل اوڈوائر لیفٹیننٹ گورنر پنجاب نے جنگ کے سلسلہ میں ایک جلسہ منعقد کیا۔ یہ جلسہ بریڈلا ہال میں ہوا۔ کثرت سے

لوگ موجود تھے۔ چند حضرات تقریریں کر چکے۔ تو ڈاکٹر صاحب شعر پڑھنے تشریف لائے۔ وہ سیاہ سوٹ پہنے ہوئے تھے۔ جوان کی گوری چٹی رنگت پر بہت بھلا معلوم ہوتا تھا۔ انہوں نے نہایت خوش الحانی کے ساتھ فارسی کے چند اشعار پڑھے ان میں سے ایک شعر یاد رہ گیا ہے ؎

ملک و تدبیر و تجارت را بانگلستاں سپرد
جرمنی را چشمِ حیران و دلِ بے تاب داد

علامہ مرحوم نے یہ شعر ختم کئے تو لوگوں نے شور مچایا اردو۔ اردو ڈاکٹر صاحب نے کسی قدر توقف کے بعد اسی دلکش ترنم کے ساتھ اپنی وہ مشہور نظم پڑھی جس کا پہلا شعر یہ ہے۔

خدا سے حُسن نے اک روز یہ سوال کیا
جہاں میں کیوں نہ مجُھے تو نے لازوال کیا

احساسِ غرور

ایک دفعہ راجہ نریندر ناتھ نے ڈاکٹر صاحب کو چائے پر مدعو کیا۔ راجہ صاحب کے کمرے میں ہرن کی کھالیں بچھی ہوئی تھیں۔ ڈاکٹر صاحب ان سے بچ بچ کے گزرے راجہ نریندر ناتھ نے حیران ہو کر وجہ پُوچھی آپ نے جواب میں بتایا۔ کہ میرے استاد محترم نے ایک مرتبہ میری دی ہوئی جائے نماز استعمال نہ کرنے کا سبب بتاتے ہُوئے انکشاف کیا تھا۔ کہ ہرن کی کھال پر بیٹھنے یا چلنے سے انسان کے دل

میں لاشعوری طور پر غرور کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ اور یہ ایک
ایسی مسلّمہ بات ہے۔ جس کا ذکر حدیث شریف میں بھی موجود ہے
راجہ نریندر ناتھ اس جواب سے اس قدر متاثر ہوئے۔ کہ
کئی منٹ تک وہ خاموش کھڑے ڈاکٹر صاحب کے چہرے
کو تکتے رہے ٭

[illegible] ۲/ ۳۶ء

عزیز من سلیم — تمہارا خط پڑھ کر مجھے بے حد خوشی ہوئی۔ مجھے یقین ہے کہ ملازمت میں تم اپنے والد مرحوم کے نقش قدم پر چلو گے اور اپنے فرائض محنت اور دیانت سے ادا کرو گے۔ محنت اور دیانت ہی ترقی کی راہیں کھولتی ہیں۔ زیادہ دعا

محمد اقبال

بانگِ رحیل

ڈاکٹر صاحب مدّت سے دردِ گُردہ اور نقرس میں مبتلا تھے۔ ۱۹۳۴ء میں عید کی نماز پڑھ کے آئے۔ گرم گرم سوّیاں کھالیں۔ فوراً گلا بیٹھ گیا۔ کئی طبیبوں اور ڈاکٹروں کا علاج کرایا۔ کوئی فائدہ نہ ہُوا۔ ہر مرتبہ نئی تشخیص۔ نیا علاج۔ نئی دوائیں پھر بڑا سخت قسم کا پرہیز کبھی کبھی تھوڑا بہت افاقہ ہو جاتا۔ لیکن مرض دُور ہونے میں نہیں آتا تھا۔ ۱۹۳۵ء میں جاوید کی والدہ کا انتقال ہو گیا۔ ان کی صحت پر اس سانحہ کا بڑا ناگوار اثر پڑا۔ اور کئی دوسرے عوارض پیدا ہو گئے اور عوارض تو ایسے خطرناک نہیں تھے۔ لیکن ایک بڑی پیچیدگی

یہ پیدا ہو گئی۔ کہ ان کا قلب پھیلنا شروع ہو گیا۔ ان کے معالج اچھی طرح جانتے تھے۔ کہ ان کا بچنا محال ہے۔ اور خود وہ بھی اپنی صحت کی جانب سے مایوس ہو چکے تھے۔ لیکن وہ نہ تو مضطرب تھے۔ اور نہ موت سے خائف اس زمانے میں بھی ان کے ہاں محفلیں جمتی تھیں بڑے بڑے دقیق فلسفیانہ مسائل پر اظہار خیال کیا جاتا تھا۔ بین الاقوامی صورتِ حال۔ اٹلی اور ایبے سینیا کی کشمکش۔ ہندوستان کے مسائل۔ لیگ اور کانگریس مسلمانوں کے حقوق اور ان کے تحفظ کے ذرائع و وسائل پر لمبی لمبی بحثیں اور گفتگوئیں ہوتی تھیں۔ انہیں باتیں کرنے میں تکلیف ہوتی تھی۔ اس لیئے ان کے عقیدت مند اس کوشش میں رہتے۔ کہ انہیں زیادہ بولنے کا موقع نہ دیا جائے۔ ڈاکٹروں اور طبیبوں

کی بھی یہی رائے تھی۔ کہ انہیں زیادہ باتیں نہیں کرنی چاہئیں
لیکن جب ان کی طبیعت حاضر ہوتی تھی تو وہ نقاہت کے باوجود
مسلسل باتیں کرتے چلے جاتے تھے۔ شعر و شاعری کا سلسلہ
بھی جاری تھا۔ میں جب ان کی خدمت میں حاضر ہوتا۔ زیادہ تر
خاموش بیٹھا رہتا تھا۔ کوئی ایسی بات نہیں کرتا تھا جو انہیں
کوئی لمبی بحث چھیڑنے پر آمادہ کر دے لیکن جب وہ کسی مسئلہ پر
اظہار خیال شروع کر دیتے تھے۔ تو انہیں روکنا کسی کے بس
کی بات نہیں تھی۔ اس زمانے میں ایک مرتبہ اپنے ایک
دوست نانک چند کے ساتھ جو سیالکوٹ کے رہنے والے
تھے۔ اور ڈاکٹر صاحب سے ملنے کے لئے بے چین معلوم
ہوتے تھے میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ یہ نانک چند

ڈاکٹر صاحب کے استادگرامی مولوی سیّد میر حسن کی محفلوں میں اکثر شریک ہوتے رہتے تھے۔ ان سے مل کے ڈاکٹر صاحب کو پرانا زمانہ یاد آگیا۔ ان دنوں ان کی حالت بہتر معلوم ہوتی تھی۔ اور ان کے اندازِ گفتگو میں پرانے زمانے کی جھلک نظر آتی تھی۔

لیکن اس واقعہ کے چند ہفتے بعد یعنی ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو صبح کے آٹھ بجے شہر بھر میں یہ خبر پھیل گئی۔ کہ حکیم الامت اپنے مولا سے جا ملے ہیں۔ نے یہ خبر سُنی تو آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے فوراً جاوید منزل کا رُخ کیا۔ ڈاکٹر صاحب کا وفادار بوڑھا ملازم علی بخش کوٹھی کے باہر چیخیں مار مار کے رو رہا تھا۔ مرحوم جس کمرے میں اکثر سویا کرتے تھے۔ اسی کمرے میں اسی پلنگ پر لیٹے

ہُوئے تھے اور سکوتِ ابدی نے انھیں اپنی آغوش میں لے لیا تھا۔ ان کے قریب چند اصحاب کے ساتھ چودھری محمد حسین اور مسٹر محمد شفیع جو آجکل پاکستان ٹائمز کے چیف رپورٹر ہیں۔ کھڑے تھے۔ ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ اور شدّت گریہ سے ہچکی بندھی ہُوئی تھی۔ میں کچھ دیر تک چپ چاپ اُن کے چہرے کو تکتا رہا۔ چہرہ اضمحلال اور پژمردگی کے آثار سے پاک تھا۔ پیشانی پر طمانیت کے زاویے اُبھرے ہُوئے تھے۔ اور ہونٹوں پر اس طرح مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ گویا حکیم الامّت زیرلب گنگنا رہے ہیں ؎

سحرہا در گریبانِ شبِ دوست
دو گیتی را فروغ از کوکبِ اوست

نشانِ مردِ مومن با تو گویم
چو مرگ آید تبسّم بر لبِ اوست

میں کچھ دیر یوں ہی چپ چاپ استغراق کے عالم میں کھڑا رہا۔ پھر یکبارگی چونک پڑا۔ اور بے تابانہ مرحوم کے کمرے سے نکل آیا۔

ہجوم ہر لمحہ بڑھتا چلا جاتا تھا۔ ہر شخص حکیم الامت کا دیدار کرنا چاہتا تھا۔ خوابگاہ کے قریب غسل خانہ تھا۔ اس کا دروازہ کھلوا دیا گیا۔ تاکہ لوگ آخری مرتبہ ان کا دیدار کر لیں۔ ڈاکٹر صاحب کے جگری دوست چودھری محمد حسین تجہیز و تکفین دوسرے لوگوں کے سپرد کر کے مرحوم کی ابدی خوابگاہ کے لئے مناسب جگہ کی تلاش میں مصروف ہو گئے۔ سب کا خیال یہی تھا۔ کہ ان کے مزار

کے لیئے کوئی ایسی جگہ منتخب کی جائے جو ان کے شایانِ شان
ہو۔ چودھری صاحب کی رائے تھی۔ کہ علاّمہ کو مسجد عالمگیری کے
سامنے دفن کیا جائے۔ اس کے لیئے محکمہ آثار قدیمہ کے افسروں
کی اجازت حاصل کرنا ضروری تھا۔ چنانچہ ٹیلیفون کے ذریعے
اجازت حاصل کر لی گئی۔ میں شام تک برابر جاوید منزل میں موجود
رہا۔ لوگوں کو معلوم نہیں تھا۔ کہ جنازہ کب روانہ ہوگا۔ لیکن شام
کے پانچ بجے جاوید منزل سے جنازہ اٹھا۔ تو کثیر تعداد میں لوگ
اس کے ساتھ تھے۔ راستہ میں اور لوگ جوق در جوق جنازہ میں شامل
ہو جاتے تھے۔ اسلامیہ کالج کے قریب پہنچ کے مجمع بہت
زیادہ ہو گیا۔ جنازہ شہر کے وسط میں پہنچا۔ تو لوگوں کی کثرت کی
وجہ سے جنازہ کو کندھا دینا ناممکن ہو گیا۔ شاہی مسجد کے سامنے

پہنچ کے نماز ادا کی گئی - اور حکیم الامت کی نعش سپرد خاک کر دی گئی

سرِ شوریدہ بر بالینِ آسائش رسید اینجا

اس حادثہ کو بارہ برس گزر چکے ہیں - لیکن کبھی کبھی یہ واقعات اس طرح ایک ایک کر کے نگاہوں کے سامنے آجاتے ہیں گویا یہ سب کچھ ابھی ابھی گزرا ہے - ڈاکٹر صاحب کی نعش سپید کفن میں لپٹی ہوئی ہے - ان کے عقیدتمند اور احباب جمع ہیں - دبی دبی سسکیوں کی آوازیں آرہی ہیں - پھر میں دیکھتا ہوں جنازہ اٹھا ہے - گریہ و بکا کا شور بپا ہے - جنازہ شہر کے گلی کوچوں میں سے گزرا چلا جا رہا ہے - لوگوں کے سر جھکے ہیں - چہرے اداس - آنکھوں کے گرد حلقے - ہر شخص یہ محسوس کر رہا ہے - گویا اقبال کی موت اس کا ذاتی نقصان ہے - جسکی تلافی ناممکن ہے

پھر میں محسوس کرتا ہوں۔ کہ ہم ان کے مزار کے کنارے کھڑے
ہیں۔ قبر کو مٹی دی جا رہی ہے۔ میرا سر جھک جاتا ہے۔ اور
زبان سے بے اختیار یہ شعر نکل جاتا ہے ؎

سبزہ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے
آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے

(کتبہ یوسف چشتی لاہور)